بھٹو خاندان
سیاست کے کربلا میں

مصنف: ثقلین رضا

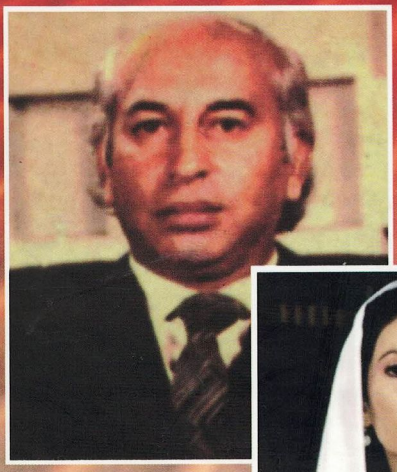

بھٹو خاندان

سیاست کے کربلا میں

مصنف: ثقلین رضا

تخلیقات

علی پلازہ، 3 مزنگ روڈ، لاہور-فون: 7238014

ویب سائٹ: http://www.takhleeqat.com

ای میل: takhleeqat@yahoo.com

جملہ حقوق بحق تخلیقات محفوظ ہیں

نام کتاب : بھٹو خاندان سیاست کے کربلا میں

ناشر : ''تخلیقات'' لاہور

اہتمام : لیاقت علی

تاریخ اشاعت : 2007ء

ٹائٹل : ریاظ

پرنٹر : علی فرید پرنٹرز لاہور

صفحات : 136 صفحات

قیمت : 100 روپے

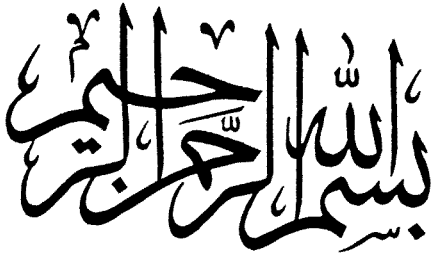
بسم الله الرحمن الرحيم

﴿ انتساب ﴾

میڈیا ٹرائل کے نام

www.bhutto.org

''حوالہ جات''

محترم منیر احمد ۔ محترم نفیس صدیقی

اور

محترم ڈاکٹر مبارک علی

www.bhutto.org

فہرست مضامین

☆ حرف آغاز ---------- 7

1- جمہوری ریاست اور عدم استحکام جمہوریت ---------- 9

2- ذوالفقار علی بھٹو ---------- 21

3- میر شاہنواز بھٹو ---------- 56

4- میر مرتضیٰ بھٹو ---------- 65

5- آصف علی زرداری ---------- 76

6- آصف علی زرداری پر عائد مقدمات کا مختصر جائزہ ---------- 98

7- محترمہ بینظیر بھٹو ---------- 105

8- محترمہ بینظیر بھٹو کی گرفتاری، نظر بندی اور جلاوطنی "ایک جائزہ" --- 111

9- محترمہ بینظیر بھٹو کو درپیش خطرات اور الزامات ---------- 114

10- محترمہ بینظیر بھٹو کے اہداف اور کامیابیوں پر ایک نظر ---------- 116

11- محترمہ بینظیر بھٹو پر عائد مقدمات ---------- 120

12- محترمہ بینظیر بھٹو کے اعزازات ---------- 124

13- آدھا سچ ---------- 126

14- جنرل پرویز مشرف کے نام ایک پیغام ---------- 132

www.bhutto.org

''حرفِ آغاز''

ہمیشہ سے محبت اظہار کی متقاضی رہی ہے۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں قطعی کوئی عار نہیں کہ جمہوریت کی بالادستی کے لیے کی جانے والی جمہوری جدوجہد اور دی جانے والی قربانیوں کے باعث میرا رجحان، میلان اور رغبت پیپلز پارٹی اور بھٹو خاندان سے فطری ہے۔ میری دوسری کاوش بصورت کتاب ''بھٹو خاندان سیاست کے کربلا میں'' بعد از کتاب ''مردِ حُر'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میری پہلی کاوش ''مردِ حُر'' کی اشاعت پر جہاں مجھے بہت سراہا گیا وہاں مجھے خاصی تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ بہر حال میرے نزدیک سراہا جانا جس قدر میرے لیے باعث راحت تھا اور ہے اسی طور تنقید میرے لیے مشعل راہ نیز نئی کاوش کا باعث بنی۔ جس کے لیے میں بالعموم ناقدین اور بالخصوص تمام قارئین کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مشکور ہوں۔

میری دوسری کتاب ''بھٹو خاندان سیاست کے کربلا میں'' بنیادی طور پر ''بھٹو خاندان'' کے گرد گھومتی ہے یقیناً موضوع کی مناسبت سے ایسا ہونا ایک ناگزیر عمل تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ گزشتہ تقریباً چار دہائیوں سے پاکستان کی سیاست ''بھٹو خاندان'' کے گرد ہی گھومتی نظر آتی ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ہمارے معتبر سیاسی مبصرین ہوں یا ''تھڑا ٹاک'' کرنے والے ''بھٹو خاندان'' کے لیے جارحانہ زویہ سے اپنی بات کا آغاز کرتے ہیں یا ''بھٹو خاندان'' کی کامیابیوں اور قربانیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے موجودہ حالات و حوادث سے کوئی حتمی نتیجہ اخذ کرنے کی سعی کر رہے ہوتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں بنیادی، شورائی اور حقیقی ''جمہوریتیں'' متعارف کرائی جاتی ہیں؟ بالآخر مختلف النوع سابقے لاحقے والی جمہوریتیں اشرافیہ کے اقتدار کو طول دینے کا ہی ذریعہ بنتی ہیں اور جمہور کو جمہوری اقدار سے دور کر دیتی ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو وہ شخص جو اشرافیہ کی صف سے نکلا اور عوام سے جا ملا۔ زبان کھینچ دینے والی اشرافیہ کے مقابلے میں اس نے عوام کو زبان دی۔ آخر اس کا کیا قصور تھا کہ اسے تختہ

www.bhutto.org

دار تک پہنچا دیا گیا؟

ذوالفقار علی بھٹو کے عدالتی قتل کے بعد وہ کونسے عوامل، مقاصد، محرکات اور عزائم ہیں کہ جن کی بنیاد پر اس کے خاندان کو نشانہ بنایا گیا؟ پہلے ان کے بیٹے میر شاہنواز بھٹو کو 18 جولائی 1985ء کو فرانس میں قتل کیا گیا اور 20 ستمبر 1996ء کو میر مرتضیٰ بھٹو ایک جعلی پولیس مقابلے میں قتل کر دیئے گئے۔ بعد ازاں ان کے قانونی بیٹے آصف علی زرداری کو پاکستان بلکہ برصغیر کی تاریخ میں طویل ترین سیاسی قید کاٹنا پڑی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی صاحبزادی ''محترمہ بینظیر بھٹو'' اور ان کے بچے جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔

محترمہ بینظیر بھٹو اور ان کے شوہر پر کرپشن کے الزامات عائد کیے گئے۔ جبکہ الزامات عائد کرنے والوں کے متعلق ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل نے ۔۔۔رپورٹ وضع کی ہے کہ ''موجودہ حکومت (2006ء-2002ء) کے دوران 67.31 فیصد افراد کی رائے میں حکومت کرپٹ ہے۔ مذکورہ رپورٹ کے مدنظر کوئی ابہام نہیں رہتا کہ محترمہ و آصف پر الزام تراشیاں کرنے والے خود کرپشن کی آخری حدوں کو چھو رہے ہیں۔ معصوم عوام کو سازش کے تحت گمراہ کر رہے ہیں۔

آج جن حالات سے ہم گزر رہے ہیں فرانس، روس اور چین میں ایسے ہی حالات نے انقلاب کو جنم دیا تھا۔ کیا ہم جیسے معاشروں میں اصلاحات ممکن نہیں؟ یقیناً ہیں کہ جس کے لیے ہمیں اپنے رویوں پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ ملک و قوم کے لیے ارباب حل عقد کو ذاتی عناد اور مفادات سے بالاتر فیصلے کرنا ہوں گے۔ ہم سب کو تحمل، رواداری، بردباری اور برداشت کو اپنانا ہوگا کہ اسی میں حقیقی، خوشحال، قابل فخر اور ترقی یافتہ پاکستان کا راز پنہاں ہے۔

مجھے کبھی یہ زعم نہیں رہا کہ میں واقعات کو روایت کرنے ان کی جزئیات بیان کرنے کی صلاحیت پر معمور ہوں۔ البتہ اس کتاب کے ذریعے میں نے اپنے عہد کے حوادث کو اسباب و اثرات کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش کس قدر کامیاب ہے اور کس قدر ناکامیاب آپ بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں اور میں آپ کے فیصلے کا انتظار۔

ثقلین رضا

الفلاح کالونی سٹریٹ نمبر نزد ایم۔ڈی۔اے روڈ ملتان

فون: 0322-6125469, 0300-7348898

www.bhutto.org

1

''جمہوری ریاست اور عدم استحکام جمہوریت؟''

برداشت، وسیع القلبی، رواداری اور قومی یکجہتی کا فقدان قوموں کو کھوکھلا کر دیتا ہے ضرورت ہے کہ ہم جمہوریت اور جمہوریت کے تقدس کو سمجھیں تا کہ بحیثیت قوم ہمارے اذہان آزاد ہو سکیں۔ ہماری آزادی جو مسدود ہو چکی ہے اُس کو نئی راہیں مل سکیں تا کہ ہم بھی دیکھ سکیں کہ ہمارے اردگرد کی دنیا بڑی وسیع اور پھیلی ہوئی ہے۔ ہماری تخلیقی صلاحیتیں زنگ آلود ہونے سے بچ جائیں اور ہم ان صلاحیتوں کی بدولت ترقی پذیری جو دراصل (پسماندگی) ہے کہ حصار سے نکل کر ترقی یافتہ قوموں میں شامل ہو سکیں۔

☆ پاکستان ایک قومی و جمہوری ریاست کیوں نہیں بن سکا؟ یا پاکستان میں عدم استحکام جمہوریت کیوں ہے؟

عصر حاضر میں جب ہمارے سامنے یہ سوال اپنی پوری سفاکی کے ساتھ موجود ہے تو اس کا جواب تلاش کرنے سے قبل ہمیں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ جمہوریت کا معنی و مطلب کیا ہے؟

جمہوریت دراصل یونانی زبان کا لفظ ڈیموکریسی کا قریب ترین'' ترجمہ ہے ۔فلسفہ اور علوم حاکمیت کے عظیم ماہر افلاطون نے آج سے تقریباً تین ہزار سال قبل ڈیمو اور کریسی کو ملا کر ڈیموکریسی کا لفظ ایجاد کیا۔ یونانی زبان میں لفظ ڈیمو کا معنی و مطلب عوام ہے اور کریسی کے معنی و مطلب حاکمیت اعلیٰ ہے۔

www.bhutto.org

آج بھی یونان میں عوام کے لیے لفظ ''ڈیمو'' ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ''ڈیموکریسی'' کا مطلب عوامی حکومت ہے۔ فارسی میں اگر ڈیموکریسی کا ترجمہ کیا جائے تو مردم سالاری کہلاتا ہے۔ جو بے حد مقبول و معروف ہے۔ عظیم فلاسفر اور علوم حاکمیت کے ماہر ارسطو ہی بیورو، آٹو اور تھیو کے الفاظ یا اصطلاح کا موجد ہے۔

☆ جس ملک میں سرکاری ملازمین حکمرانی کرتے ہوں وہ بیوروکریسی کا ملک کہلاتا ہے۔

☆ جس ملک میں فرد واحد مطلق العنان حکمرانی اور حکمرانی کے اصول وضع کرے وہ آٹوکریسی کا ملک کہلاتا ہے۔ اور

☆ جس ملک میں مذہبی قیادت حکومتی امور پر اپنی مرضی مسلط کرے وہاں کی حکومت کو تھیوکریسی کی حکومت کہا جاتا ہے۔

''بہر حال۔ ڈیموکریسی، مردم سالاری، جمہوریت اور عوامی حکومت کی متفقہ تعریف مختصراً ابراہیم لنکن کے ۔۔۔۔۔۔الفاظ میں اس طرح کی جاتی ہے۔

''عوام کی حکومت عوام کے لیے عوام کے ذریعے''

اس متفقہ تعریف میں تیسرا پہلو ''عوام کے ذریعے'' اپنے اندر اہمیت کی معراج ہے۔ ''گویا'' یہ عوام پر منحصر ہے کہ وہ اپنے اوپر حکومت کا کیا طریق کار اختیار کرتے ہیں؟ جب تک اس طریق کار میں عوام کی حکومت کو اور عوام کی مرضی اور رائے کو عمل دخل حاصل رہتا ہے۔ تب تک وہ حکومت جمہوری حکومت کہلاتی ہے اور جونہی حکومت عوام کی خواہشات، مفادات اور امیدوں کو درخور اعتنا نہ سمجھے اور عملی طور پر عوام کی نمائندگی کے برعکس کام کرنا شروع کردے تو وہ غیر جمہوری بن جاتی ہے۔

جب کسی بھی حکومت کی تشکیل سے قبل رائے عامہ سے رجوع کیا جائے تو علم سیاست میں اُسے انتخابات کہا جاتا ہے۔ حکومت خواہ کتنی ہی عوام دوست اور عوام پسند ہو خواہ کتنی ہی اصول پرست اور انصاف پسند ہو اگر عوامی رائے (انتخابات) کے بغیر ایوان اقتدار حاصل کرے جمہوریت نہیں کہلا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں اب تک جتنے سیاسی نظام متعارف کرائے گئے ہیں ان میں جمہوریت کو سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور کامیاب سیاسی نظام تسلیم کیا گیا ہے۔ سماجی ارتقاء ہزاروں برسوں پر پھیلی ہوئی تاریخ میں غلامی کا دور

www.bhutto.org

، جاگیردارانہ نظام، قبائلی معاشرے، شخصی آمریتیں، بادشاہتیں وہ زینے ہیں جن سے گزر کر اب انسانی معاشرہ جمہوریت پر فردکش ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ جمہوریت کی متفقہ تعریف

''عوام کی حکومت، عوام کے لیے، عوام کے ذریعے'' قرار پائی ہے تو ظاہر ہے کہ جمہوری نظام سیاست میں طاقت کا اصل سرچشمہ عوام ہیں۔

درج بالا تعریف جمہوریت سے جمہوریت کی اہمیت واضح اور غیر متنازعہ ہے تو پھر ہمارا ملک پاکستان کیوں ایک قوی جمہوری ریاست نہیں بن سکا؟ یا

☆ پاکستان میں عدم استحکام جمہوریت کیوں ہے؟

تو اس سوال کا جواب فقط 1947ء کے بعد واقعات وحالات سے ہی نہیں بلکہ اس جواب کا تعلق برصغیر مسلمان معاشرہ کی اس ذہنی وفکری ساخت سے ملتا ہے کہ جو ایک خاص ماحول میں پروان چڑھی یعنی ہمارے ملک میں عدم استحکام جمہوریت کی وجہ ہمارے ماضی و حال میں پایا جانے والا ایک خاص تسلسل ہے۔

شمالی ہندوستان میں مسلمان حملہ آور محمود غزنوی (998ء-1030ء) کے زمانہ سے آنا شروع ہوئے اور محمد غوری (1203ء-1206ء) کی فتوحات کے بعد انہوں نے یہاں حکومت قائم کر لی۔ لیکن یہ حکومت ہندو ریاستوں میں گھری ہوئی تھی۔ اس لیے مستقل طور پر غیر محفوظ تھی لہٰذا ترکوں کی حکومت کی بقاء اور تحفظ اس میں تھا کہ دہلی کے تخت پر ایک مضبوط حکمران ہو۔ جس کے پاس مستعد، جدید اسلحہ سے لیس تجربہ کار فوج ہو۔ تاکہ وہ اپنی ہمسایہ ریاستوں کے خلاف مسلسل جنگ کی پالیسی جاری رکھ سکے۔ اس مرحلہ پر مسئلہ یہ بھی درپیش تھا کہ فوج کے لیے نئے لوگوں کو کہاں سے اور کیسے حاصل کیا جائے؟ یقیناً یہ فوجی انہیں ان مسلمان آبادیوں سے ہی مل سکتے تھے جو فتح کے بعد مفتوحہ علاقوں میں قائم ہو گئیں تھیں۔ ان لوگوں کو ذہنی طور پر فوج میں شامل ہونے اور جنگوں میں جان دینے کے لیے اس وقت تیار کیا جا سکتا تھا۔ جب ان لوگوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کر دیا جائے۔

اور یہ ممکن اس طرح ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں مذہب کی گہری تفریق کو ابھارا جائے۔ اس لیے ہندو اکثریت اور ہندو ریاستوں کے حملے کے خوف

www.bhutto.org

نے مسلمانوں کی اس ذہنیت کو پیدا کیا کہ ان کی حفاظت صرف اسی صورت ممکن ہے کہ جب ایک مطلق العنان حکمران ہو۔ مضبوط مرکز ہو اور طاقتور فوج ہو۔ ان کے خیال میں ہندوستان میں ہندو اکثریت کے خلاف صرف طاقت اور قوت کی بنیاد پر زندہ رہا جا سکتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں میں ان حکمرانوں کا بڑا احترام پیدا ہوا کہ جنہوں نے جنگوں اور فتوحات کی پالیسی پر عمل کیا۔ اس کے برعکس جن حکمرانوں نے جنگی معاملات میں کمزوری دکھائی ان پر زبردست تنقید کی گئی اور حکومتی زوال کی ذمہ داری ان پر ڈال دی جاتی رہی۔

ہندوستان کے حکمران اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ ان کے اقتدار اور طاقت کی بنیاد مسلمان جماعت ہے لہٰذا ان کی حمایت قائم رکھنے کے لیے مذہب کا استعمال جاری رکھا گیا۔ اسی لیے ہندوستان کے تمام مسلمان حکمران خود کو حامی دین اور محافظ مذہب وملت کہلاتے رہے۔ اگرچہ وہ عملی طور پر سیاسی نظام کو سیکولر بنیادوں پر چلانے پر مجبور تھے مگر انہوں نے عوام کی حمایت کی خاطر مذہب کو اس طرح استعمال کیا کہ علماء کی سرپرستی کی، صوفیاء ومشائخ کو تحفہ تحائف ونذرانے دیے اور چند مذہبی قوانین کو کہ جن کا تعلق عملی طور پر سیاسی نظام اور ان کے مفادات سے نہیں تھا انہیں برقرار رکھا۔ ساتھ ہی انہوں نے مسلمانوں میں اس ڈر اور خوف کو پیدا کر دیا کہ اگر ان کی حکومت ختم ہو گئی یا کمزور ہو گئی تو مسلمان جماعت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کی مثال خلجی دور کے ایک واقعہ سے اس طرح دی جا سکتی ہے کہ:

خسرو ملک نامی ایک ہندو نژاد غلام تھا اس نے خلجیوں کے آخری حکمران قطب الدین مبارک (1316ء-1320ء) کو قتل کر دیا اور تخت پر قابض ہو گیا۔ اس قبضہ کے فوراً بعد ایک پراپیگنڈا کیا گیا کہ ایک ہندو سلطنت دہلی پر قابض ہو گیا ہے جس کی وجہ سے اب مسلمانوں کی جان و مال خطرے میں ہے۔ یہی ڈر اور خوف وجہ بنا اور مسلمان امراء غیاث الدین تغلق (1320ء-1325ء) کی قیادت میں متحد ہو گئے اور خسرو ملک کو شکست دے کر دوبارہ دہلی کا تخت حاصل کر لیا جس کے بعد مسلمان امراء کو اطمینان ہوا کہ ان کی جائیدادیں اور مراعات محفوظ ہو گئیں۔

(یہ ایک الگ بحث کہ خسرو ملک مسلمان تھا۔)

www.bhutto.org

اس کی دوسری مثال اکبر کی مذہبی رواداری کی پالیسی ہے کہ جس کی وجہ سے راسخ العقیدہ امراء میں زبردست ہراس پیدا ہو گیا۔ اسلام خطرے میں ہے کا نعرہ لگا کر علماء نے اس پالیسی کی سخت مخالفت کی۔ مسلمان امراء چاہتے تھے کہ اقتدار میں صرف انہی کو حصہ ملے اور کسی دوسرے کو اس میں شریک نہ کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے مذہب کو استعمال کیا جاتا تھا۔ کیونکہ اگر ریاست کو اسلامی کہا جائے تو اس صورت میں اس کے نظم ونسق کو چلانے کی ذمہ داری صرف مسلمانوں کی ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے مفاد میں تھا کہ ریاست کو اسلامی کہا جائے اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں ثقافتی اور سماجی تفریق ضرور رکھی جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے قریب نہ آسکیں۔

اگر چہ نچلے طبقے کے مسلمانوں کی حالت میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا مگر وہ اپنے حکمرانوں پر محض اس لیے فخر کرتے تھے کہ ان کا تعلق ایک ہی مذہب سے ہے۔ اور اسلامی مساوات کے واہمہ میں مبتلا رہے۔ ہندوستان میں مغل خاندان کے زوال کے ساتھ ہی مسلمان حکمران طبقوں کی بنیاد جن ستونوں پر استوار تھی وہ ٹوٹ گئے یعنی طاقتور حکمران اور مضبوط و مستعد فوج ان کی اس کمزوری کے ساتھ ہی جب سکھوں، جاٹوں اور مراہٹوں نے مغل سلطنت پر حملے کیے تو انہوں نے اپنی کھوئی ہوئی طاقت کا نعم البدل ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی (1773 - 1747ء) کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تاکہ ایک طاقتور شخصیت اور مضبوط فوج مسلمانوں کی حفاظت کر سکے۔

بعد میں سید احمد شہید (وفات 1731ء) بھی اسی ذہنیت کا نتیجہ تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو امیر المومنین کی شخصیت اور جہاد کے ذریعے بچایا جا سکے۔ 1857ء کے ہنگامہ کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مسلمان حکمران طبقوں کی آخری کوشش تھی کہ وہ طاقت کے ذریعے اپنی حکومت کو بحال کرنا چاہتے تھے۔ اس میں ناکامی کے بعد ان میں مزاحمت کرنے کی تمام خواہشات دم توڑ گئیں۔ لہٰذا جب ہندوستان میں انگریز اقتدار قائم ہوا تو مسلمان طبقے اپنی قوت وتوانائی کھو چکے تھے۔ اسی وجہ سے سید احمد خان نے دیکھا کہ ان کا مفاد اس میں ہے کہ وہ انگریزی سے مفاہمت کر کے اپنے مفادات کا تحفظ کریں۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید احمد خان اور مسلمان امراء طبقہ ہندوستان میں انگریز حکومت کے دائمی قیام کا

www.bhutto.org

خواہش مند تھا۔ اس طرح سے وہ ہندو اقتدار کو روک سکتے تھے۔ جس کا اظہار سرسید احمد خاں نے 1901ء میں محمڈن پولیٹیکل آرگنائزیشن کے اجلاس میں کیا۔

"مسلمانوں کی بہبود ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کے دوام اور استحکام پر منحصر ہے۔ کانگریس میں نیابتی حکومت اور امتحانات کے اجراء کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو مسلمانوں کے لیے مضر ہے اس لیے مسلمانوں کو اس میں شرکت سے روکا جائے۔"

دسمبر 1906ء میں ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"ہماری تعداد بمقابلہ دوسری قوموں کے ہندوستان میں ایک خمس ہے۔ اب اگر کسی وقت ہندوستان میں خدانخواستہ انگریزی حکومت نہ رہے تو ہمیں ہندوؤں کا محکوم بن کر رہنا پڑے گا اور ہماری جان، ہمارا مال، ہماری آبرو، ہمارا مذہب سب خطرہ میں ہوگا۔"

جب مسلمان امراء اور مراعات یافتہ طبقہ نے اپنا تحفظ انگریزی حکومت کے حوالے کر دیا اور اپنے مفادات کو ان کی حکومت سے منسلک کر دیا تو اس کے بعد انہوں نے ہر اس تحریک کی مخالفت کی جو انگریز حکومت کو کمزور کر سکتی تھی۔ اسی وجہ سے سرسید نے کانگریس کے قیام پر تنقید کی جب کانگریس کی جانب سے ہندوستانیوں کی نمائندگی کا سوال اٹھایا گیا تو سرسید نے مسلمان امراء کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ استدلال دیا کہ:

"چونکہ انتخابات کی صورت میں ہندو ووٹرز تعداد میں زیادہ ہوں گے اور مسلمان کم اس لیے ہندو امیدوار زیادہ کامیاب ہوں گے انہوں نے نمائندہ طریق نظام کی مخالفت کرتے ہوئے یہ دلیل بھی دی کہ مسلمان جائیداد دولت اور تعلیمی قابلیت میں ہندوؤں کے برابر نہیں اس لیے انتخابات کا جو بھی طریق کار ہوگا اس میں ہندو ہی کامیاب ہوں گے اور مسلمان ان سے کسی بھی صورت مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

اس کا جو منطقی نتیجہ نکلا وہ یہ کہ انگریزی حکومت ہندوستانیوں کی شرکت کے بغیر حکومت اور مسلمان اس حکومت کے وفادار رہیں۔ چونکہ انگریز حکومت کے مفاد میں یہ بھی

www.bhutto.org

تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد نہ رہے اور ہندوؤں نے جو سیاسی تحریک شروع کر رکھی ہے مسلمان اس سے دور رہیں اس لیے انگریز حکومت نے مسلمانوں میں جمہوریت کے خلاف جذبات پیدا کیے۔

علیگڑھ کالج کے پرنسپل تھیوڈور ماریسن نے ایک بار طلباء سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''جمہوری حکومت اقلیتوں کو لکڑی کاٹنے والے اور پانی بھرنے والوں کے درجہ پر پہنچا دے گی اور مسلمانوں کا ملک میں نام و نشان باقی نہ رہے گا۔'' اس لیے منظر میں مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ کہ جن کا تعلق امراء کے مراعات یافتہ طبقہ سے تھا ان میں جمہوریت کی مخالفت پیدا ہوگئی اور انہوں نے جمہوری نظام کو صرف اس نگاہ سے دیکھا کہ اس میں اقلیت کے لیے کوئی اہمیت و حیثیت نہیں ہوگی اور وہ اکثریت کے ہاتھوں بے بس ہو کر رہ جائیں گے۔ اس ذہنیت کو تقویت دینے کے لیے ان کے تاریخی شعور نے بھی حصہ لیا کیونکہ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ وہ اس ملک کے حکمران رہ چکے ہیں۔ اور انہوں نے طاقت، قوت، رعب اور دبدبہ سے ہندوؤں پر حکومت کی ہے اور وہ نسلاً ان سے اعلیٰ و برتر ہیں۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ حکومت ہندوؤں کے پاس چلی جائے اور وہ ان کے محکوم ہو جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کے نزدیک جمہوری طرز حکومت ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت کی حکومت قرار پائی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جمہوریت کے بارے میں یہ خیالات اور منطق مسلمان امراء اور طبقہ بالا کی تھی کہ جن کا تعلق اشراف سے تھا اور جو مسلمانوں کے نچلے طبقے سے کسی قسم کے سماجی و معاشرتی روابط نہیں رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ انگریز حکومت کے اسکولوں میں انہوں نے اپنے بچوں کو اس لیے نہیں بھیجا کہ وہاں عام لوگوں کے بچوں کے ساتھ ان کے بچوں کو بیٹھنا پڑے گا۔ یہ اشرافیہ اپنے رتبہ و منصب کے بارے خاصے حساس تھے۔ چونکہ جمہوریت کے تصور میں عوام کی نمائندگی ہوتی ہے یہی نکتہ ان کی ذہنیت سے تضاد رکھتا تھا۔ اس لیے انہوں نے انگریز حکومت پر ہمیشہ زور دیا کہ وہ تعداد نہیں اثر و رسوخ دیکھے۔

جس کی مثال ''یوپی کے مسلمانوں کی نمائندگی کی وہ اپیل ہے'' جس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ

www.bhutto.org

"وہ (اشرافیہ) اس ملک کے جاگیردار تھے اور اب تک ان صوبوں میں ان کا اثر و رسوخ ہے اس لیے ان کے حقوق کے بارے میں تعداد کی بجائے ان کے خاندان کی حیثیت و اہمیت کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔"

ان کی کوشش تھی کہ بحیثیت اقلیت حکومت کی خوشنودی کے ذریعہ اپنی مراعات کا تحفظ کریں اور عام مسلمانوں میں بے چارگی و پسماندگی کا احساس ختم نہ ہونے دیں تاکہ وہ یہی سمجھتے رہیں کہ جمہوریت میں ان کی فلاح و بہبود نہیں۔ اس سے مسلمان امراء کے طبقے کے ذہن کی پوری پوری عکاسی ہوتی ہے جو عوام میں مل کو اپنا سماجی مرتبہ کھونا نہیں چاہتے تھے اور بحیثیت طبقہ بالا اپنی حیثیت تسلیم کروانا چاہتے تھے۔ اس اشرافیہ و طبقہ بالا نے مسلمان عوام کی اکثریت کہ جن کا تعلق کسانوں، مزدوروں اور نچلے درجے کے کام کرنے والوں سے تھا۔ ان کی معاشرتی حالت بہتر بنانے کا نہیں سوچا۔ ان حالات نے ہندوستان میں مسلمان جماعت کی جس ذہنیت کی تشکیل کی اس کی بنیادیں بالآخر یہ ثابت ہوئیں۔

اوّل۔ اکثریت کو بیرونی خطرے سے خوفزدہ رکھنا۔

دوم۔ مضبوط شخصیت اور فوجی قوت ہی کو حکومت کا ضامن رکھنا۔

سوم۔ مذہب کو خطرہ ہے کا نعرہ قائم رکھنا۔

یہی اساس قیام پاکستان کے بعد بھی حکمران طبقے (اشرافیہ) کا طریقہ واردات رہا ہے اور ۔۔۔۔۔۔ جاری و ساری ہے۔

اگر ہم "اسلامی جمہوریہ پاکستان" کی جمہوری سیاسی جماعتوں کا مختصر جائزہ لیں تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ "ہمارے معاشرے میں پروان چڑھنے والی سیاسی جمہوری جماعتوں کا عمل مایوس کن رہا ہے۔ کیونکہ ان جماعتوں کے اندر ذہنی و احتجاجی تحریک، عقائد و نظریات، سماجی حیثیت، رہنما اصول و منشور، جمہوری انداز زیست، ذاتی و اجتماعی شعور جمہوریت، قطرے سے گہر ہونے تک کا سفر، جمہوریت کی ماہیت، جمہوریت کے اصل نقش و نگار اور جمہوریت کے طریقہ کار سے حاصل ہونے والی مقبولیت کا فقدان پایا جاتا ہے۔"

(ماسوائے پیپلز پارٹی اور اکا دکا جمہوری و سیاسی جماعتوں کے)۔

سیاسی جماعتوں کی تاریخ سادہ مگر حیران کن ہے۔ تقسیم پاک و ہند سے قبل

www.bhutto.org

''یونینسٹ پارٹی'' انگریز سامراج کی وفادار تھی۔ انگریز سامراج کے اشارہ ابرو اپنا، پرایا دیکھے بغیر انگریز سامراج کی ہر جائز و ناجائز خواہش کی تکمیل کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھی۔ ''یونینسٹ پارٹی'' کے کرتا دھرتا رہنماؤں کی اکثریت مشہور جاگیرداروں اور زمینداروں پر مشتمل تھی۔

1946ء میں کانگریس نے اپنے منشور میں تبدیلیاں کیں ان تبدیلیوں سے ''یونینسٹ پارٹی'' کو کسی قسم کا فرق نہ پڑتا تھا۔ لیکن کانگریس منشور میں جب زرعی اصطلاحات کا اعلان کیا گیا تو پھر ''یونینسٹ پارٹی'' اور دراصل مفاداتی ٹولہ اپنی اپنی زمینیں اور جاگیریں بچانے کی خاطر مسلم لیگ میں شامل ہو گیا۔ اپنے ذاتی مفادات کا تحفظ بھی کرتا رہا اور 1947ء میں ''مسلم لیگ'' کے رہنما و سیاست دان بھی بن گئے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ان لوگوں نے خوبصورت ڈرامہ رچایا اور جاگیردار اپنی پر فریب ''جو کرانہ'' صلاحیتوں سے ''مسلم لیگ'' کے مالک و وارث بن گئے اور پاکستان کے خالق ہونے کا دعویٰ بھی کرنے لگے۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا اور بعض اوقات بے رحم اور سفاک بھی ہو جاتا ہے۔

وقت کی بے رحمی و سفاکی سے زیادہ عوام کی معصومیت کام آئی اور موقع شناس و خودغرض نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود روپوں کی طرح اپنی بدبودار۔ غلیظ ذہنیت کے ساتھ منظر عام ہونے لگے۔ جتنی بڑی ضمیر فروشی اتنا بڑا نام ملتا چلا گیا۔ آج 59 برس بیت گئے مگر مسلم لیگی رہنماؤں کی کڑی کسی نہ کسی حوالہ سے ''یونینسٹ پارٹی'' سے ہی ملتی ہے۔

اپنے پرانے فارمولے کے تحت ''ذاتی مفادات'' کا تحفظ کرتے نظر آتے ہیں۔ اپنے منشور پر ثابت قدم اپنی املاک اور معاشی بہتری کے لیے بھرپور محنت و تندہی سے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ موجودہ مسلم لیگ قائداعظم محمد علی جناحؒ کے نقش قدم پر چلنے کے دعویدار دراصل اپنا ایک مخصوص سیاسی سے زیادہ معاشی کلچر رکھتے ہیں اور یہی ان کی پہچان ہے۔

اسٹیبلشمنٹ اور سرکار سے وفاداری ان کا منشور ہے۔ جو تقسیم پاک و ہند سے قبل ''یونینسٹ پارٹی'' کا تھا۔ یہی نکتہ بلکہ ''متفق نکتہ'' ''یونینسٹ پارٹی'' اور موجودہ مسلم لیگ کو

www.bhutto.org

یکجا کر دیتا ہے۔ موجودہ مسلم لیگ ہو یا تاریخی یونینسٹ پارٹی ایک کا حال اور دوسری پارٹی کی تاریخ ''سرکار سے وفاداری'' ان کا محور ہے اور دونوں مختلف ناموں سے (دراصل ایک ہی پارٹی) اپنے محور کے گرد محو گردش ہیں۔

1956ء میں بمشکل جان جوکھوں میں ڈال کر پاکستان کے بننے کے تقریباً 9,10 سال بعد ملک کو نیم جاں آئین 1956 نصیب ہوا۔ اسکندر مرزا فلاحی مملکت پاکستان کے پہلے صدر بنے۔ سمجھدار کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے بس اسکندر مرزا کا اشارہ کرنا تھا کہ یہ مفاد پرست عناصر اپنی ذہنیت و تاریخ کے عین مطابق بغیر کوئی لمحہ ضائع کیے'' ریپبلکن پارٹی'' کی صورت اسکندر مرزا کی وفاداری کا راگ الاپنے لگے۔

پاکستانی تاریخ کا ناقابل فراموش'' شب خون'' جب جنرل ایوب خان نے اسکندر مرزا کی حکومت پر مارا تو یہی گروہ اپنے مفادات کے پیش نظر'' کنونشن لیگ'' کے نام سے جنرل ایوب خان کے سامنے دھمال ڈالنے لگا۔ جو کہا گیا کرتے چلے گئے فقط سنا اور سمجھے بغیر عمل کرتے گئے اور ثابت کر دیا کہ ان کا منشور اسٹیبلشمنٹ اور سرکار سے وفاداری ہے۔ 1970ء میں یحییٰ خان تخت نشین ہو گیا۔ بہت بہادر اور نڈر آدمی تھا اُس نے بہادری کی ایک تاریخ رقم کی ملک کو دولخت کیا۔

''نہ زن مرد نہ زن عورت''

بھارتی فتح کی علامت اور پاکستانی شکست کا ثبوت یحییٰ خان

حاصل مقصد یہ ہے کہ مفاداتی ٹولہ ایسے شخص کے درباری بھی بنے رہے اور ہر حکم کی بجا آوری کرتے رہے اسی صاحب تخت یحییٰ خان کی خواہش کے مطابق اور اس کے آشیر باد سے'' بھٹو شہید'' کی حد درجہ مخالفت کرتے رہے۔ بھٹو شہید کی پارٹی'' پی پی پی'' کے برسر اقتدار آتے ہی'' مسٹر زیڈ اے بھٹو'' کے قدموں میں آگرے اور ایک نعرہ سوتے، جاگتے، اٹھتے، بیٹھتے مسلسل لگاتے رہے کہ'' بھٹو کے ہاتھ مضبوط کرو''۔ بعد میں یہی لوگ ضیاء کی گیارہ سالہ آمریت کو خلافت کا درجہ دیتے رہے اور ضیاء کے ساتھ ایک طویل عرصہ اسلام نافذ کرتے رہے اس سے قبل ملک میں اسلام کہاں تھا؟ ضیاء کا دور ختم ہوا تو کس حد تک ملک میں نفاذ اسلام ہو چکا تھا؟ اللہ جانے البتہ ہیروئن، کلاشنکوف اور سیاسی دسلکی

www.bhutto.org

دہشت گردی کا عمل مضبوط بنیادوں پر استوار ہو چکا تھا۔ جس کی باقیات قوم آج تک بھگت رہی ہے۔

اب یہی اشرافیہ اپنے فن قدیم پر مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ ''فن عرضی نویس'' پر بھی عبور حاصل کر چکی ہے۔ خوبصورت املا (Dictation) نہ صرف لکھ سکتی ہے بلکہ ازبر بھی کر لیتی ہے اور عمل کرتی ہے کہ کمال کرتی ہے؟ ان مذکورہ خوبیوں کے پیش نظر کیسے ممکن ہے کہ جنرل پرویز مشرف اپنا دست شفقت ان پر نہ رکھیں۔

البتہ اکتوبر 2002ء کے الیکشن میں متحدہ مجلس عمل پہلی بار ایک واضح حیثیت سے سامنے آئی یا لائی گئی۔ 2002ء کے الیکشن سے قبل افغانستان پر امریکی حملے کے بارے رائے عامہ میں تضاد نظر آنے لگا۔ جہاں دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ کے حامی افراد موجود تھے وہاں امریکی حملے کے مخالف افراد کی کمی بھی نہ تھی۔ یہ موقع بہترین تھا لہٰذا موقع کی مناسبت سے ''مذہبی جماعتیں'' یکجا ہو گئیں اور اس یگانگت کی کوکھ سے متحدہ مجلس عمل نے جنم لیا۔ الیکشن میں امریکی مخالفت سے عوامی ہمدردیاں حاصل کی گئیں۔ امریکہ کے خلاف ایسے ایسے تلفظات کا استعمال کیا گیا کہ جن میں اسقدر زہر تھا کہ لغت جواب دے گئی۔

علماء کرام نے انتخابات کے قریب طالبان کی مظلومیت پر نوحہ گری شروع کر دی، اپنی اذانوں میں مجاہدانہ رنگ جمایا اور اپنے انتخابی نشان ''کتاب'' کو قرآن مجید قرار دے دیا اور کلام اللہ (قرآن مجید) ہاتھوں پر اٹھا کر بظاہر وائٹ ہاؤس کے در و دیوار ہلا دینے والی تقریریں کیں اور عوام سے کہا کہ ''ہمیں اقتدار کی خواہش نہیں ہم اللہ اور اس کے آخری نبیؐ کے سپاہی ہیں ہمیں اتنا اختیار دو کہ ہم ایوانوں میں جا کر آواز حق بلند کر سکیں اگر عوام نے ہمارا ساتھ دیا تو پاکستان میں امریکی اور ایف بی آئی کے اہلکار نظر نہ آئیں گے۔

ریفرنڈم، ایل ایف او اور یکطرفہ آئینی ترمیم نظر نہ آئے گی۔ سب کچھ عوام کی خواہشات کے مطابق ہوگا۔ غریب، مظلوم و سادہ لوح عوام نے ''متحدہ مجلس عمل'' پر اعتبار کیا اور متحدہ مجلس عمل صوبہ سرحد میں مکمل حکومت اور بلوچستان میں نصف حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ وفاق میں سپیکر قومی اسمبلی کے صوابدیدی اختیارات کی بدولت اپوزیشن لیڈر بلکہ فرینڈلی اپوزیشن لیڈر بن گئے۔ عوام سے کیے گئے وعدوں کی متحدہ مجلس

www.bhutto.org

عمل نے عملاً اس طرح پاسداری کی کہا کرتے تھے کہ "ریفرنڈم قبول نہ ہوگا لیکن قبول کیا، جنرل پرویز مشرف کو صدر نہیں مانا جائے گا لیکن جنرل پرویز مشرف کو صدر مان لیا گیا، کہا گیا کہ (لیگل فریم ورک آرڈر) ایل۔ایف۔او تسلیم نہ کیا جائے گا لیکن تسلیم کیا گیا۔ دانا آپریشن پر مذاکرات کرتے ہوئے حکومتی نکتہ نظر کے مطابق اور رجسٹریشن کو ضروری مان لیا گیا یہ وضاحت بھی گوارا نہ کی کہ رجسٹریشن کے بعد حفاظتی ذمہ داری کون قبول کرے گا؟ مفاداتی ٹولے کی روایات کے عین مطابق متحدہ مجلس عمل نے عملاً ثابت کر دیا کہ اس کا منشور بھی اسٹیبلشمنٹ اور سرکار کی وفاداری ہے۔

اس مختصر سیاسی جماعتوں کی دروغ بافیوں اور چڑھتے سورج کی غلامی دیکھ کر یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ وہ کیا وجوہات ہیں کہ ہمارے ملک میں جمہوریت اپنے صحیح اطوار کے ساتھ اور مکمل معنویت سے نہ پنپ سکی؟

اسی اشرافیہ نے رموز مملکت کو اپنی جاگیر اور اپنی ملکیت سمجھ لیا ہے۔ عوام کو رموز مملکت سے دور رکھنے کی ہمیشہ سعی کرتے رہتے ہیں۔ تاریخ نے ثابت کیا اور مزید مستقبل بھی ثابت کر دے گا کہ آمریت پسند یا آمرانہ حکومتوں کے زیر سایہ اور زیر شفقت تعمیر ہونے والی یا متحد و انضمام پذیر ہونے والی جماعتیں حکمرانوں کے جاتے ہی نہ صرف غیر متحدہ ہو جاتیں ہیں بلکہ ان کا بکھر جانا آخری نتیجہ ہوتا ہے۔

www.bhutto.org

2

''ذوالفقار علی بھٹو''

''طبقہ بالا اور عوام میں تفریق رکھنا نیز اپنی مراعات کو مقدم رکھنا'' حکمران طبقوں کی یہی ذہنیت تھی جو قیام پاکستان کے بعد بھی برقرار رہی اور کسی نہ کسی شکل میں پاکستان کے سیاسی عمل میں اس کا کردار رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو ''دستور'' بن سکا اور نہ ہی انتخابات کا باقاعدہ عمل۔

بالخصوص 1955ء میں گورنر ''غلام محمد نے بیوروکریسی کی مدد سے دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا اور عدلیہ نے اس فیصلے کو توثیق کر دی تو اس کے بعد سے پاکستان میں جمہوری عمل کی راہیں مسدود ہو گئیں اور پاکستانی قوم کے تشکیل ہونے کے امکانات بھی کم ہوتے چلے گئے۔

جمہوری عمل کے خلاف ابتداء ہی سے پاکستان کے حکمران طبقوں نے اس طریق کار کو اختیار کیا کہ انہوں نے عوام میں اس ڈر اور خوف کو پیدا کیے رکھا کہ ''ہر لحہ اس ملک کا وجود خطرے میں ہے اور یہ دشمنوں میں گھرا ہوا ہے جو اس کو کسی بھی لمحے ٹکڑے ٹکڑے کر سکتے ہیں۔'' خصوصیت سے ہندوستان کے حملے کا خطرہ لوگوں کے ذہنوں میں بٹھا دیا گیا۔ اس طرح اس پس منظر میں تاریخی نظریہ کو تقویت دی گئی کہ ایک طاقتور، مطلق العنان شخصیت اور جدید اسلحہ سے لیس مستعد فوج اس ملک کی بقاء کی ضامن ہے۔ جس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ 1965ء کی جنگ ہوئی تو یہ کہا گیا کہ ''اچھا ہوا کہ محترمہ فاطمہ جناح ملک کی سربراہ نہ تھیں ورنہ وہ اس ملک کا دفاع نہ کر سکتی تھیں۔ اور ایوب خان کی ذات میں

www.bhutto.org

انہیں اس ملک کی حفاظت کرنے والا مل گیا۔" افسوس یہ کہ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اگر محترمہ فاطمہ جناح سربراہ ہوتیں تو 1965ء کی جنگ نہیں ہوتی۔ اسی خوف اور ڈر کی وجہ سے عوام یہی سمجھتے ہیں کہ آمر اور مطلق العنان شخصیتیں "ڈنڈے" سے اس ملک کے مسائل کو حل کر سکتی ہیں۔ اسی لیے ہر فوجی حکومت کے آنے پر عوام میں نئی امیدیں پیدا ہوئیں۔ اسی طرح سے طاقتور فوج کا تصور جو مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کا موثر کردار ادا کر رہا ہے اسے ہندوستان کے مقابلے پر ایک مرتبہ پھر جمہوریت کی بجائے فوجی لباس میں حکمرانی کی سند مل گئی۔ اور پھر ہماری فوج نے اپنے اقتدار کو طول دینے اور جمہوریت کو دبانے کے لیے مذہب کا خوب استعمال کیا چونکہ تحریک پاکستان کی اصل بنیاد تو "مذہب" کو ہی قرار دیا جاتا ہے۔

بلاشبہ پاکستانی سیاست کی تاریخ میں زیادہ عرصہ اقتدار فوجی حکومتوں کے پاس رہا اور پھر پاکستان مسلم لیگ چونکہ اشرافیہ کی جماعت رہی ہے اور فوجی طاقت کے ذریعے اقتدار میں رہنا اور اقتدار میں فوج کو حصہ دینا یا فوج سے حصہ لینا اور پھر اس عمل کا جاری رکھنا مسلم لیگی اشرافیہ کے لیے اس لیے آسان ہے کہ اس کی جڑیں عوام کی بجائے سول و فوجی افسر شاہی اور عدلیہ کے ناخداؤں میں ہیں۔ اور فوجی حکمران طبقے کے لیے یہ اشرافیہ اس لیے بھی مناسب ہے کہ اسلام کے نام پر یہ فوج کو اور فوج ان کی حکومت کو اور دراصل اپنی حکومت کو طول دیتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح جمہوری اقدار کی پاسداری حقیقی معنوں میں نہیں کی گئی۔ اس سارے تناظر میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان میں سول نوکر شاہی، فوج اور عدلیہ (حکمرانی کے اصل ادارات) مضبوط سے مضبوط تر ہوتے چلے گئے اور ان میں مخفی تعلق و تعاون بڑھتا چلا گیا۔ جیسے جیسے ان کی قوت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے ملک سے حقیقی پارلیمانی جمہوریت اور عوامی سیاسی جماعتوں کا مستقبل تاریک کرنے کا گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

مختصراً اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ وہ حالات ہیں جن کی بناء پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان تمام عوامل و اسباب کی بدولت ہمیشہ یہ جواز پیش نظر رہا کہ فوج پاکستان میں اشرافیہ، عدلیہ، سول نوکر شاہی کے ساتھ مل کر سیاسی جماعتوں، عوامی جمہوریت اور پارلیمانی طرز ہائے جمہوریت کا راستہ روکے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ غیر جمہوری اقدامات سے بھری پڑی

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو

www.bhutto.org

ہے۔ آج بھی ایسے افراد و اشرافیہ موجود ہیں جو فوج کی حمایت، صدارتی نظام کی حکومت، دو جماعتی نظام، سیاسی جماعتوں کے کردار کا خاتمہ، آئین کی تبدیلی اور فرد واحد کی شخصیت اور طاقت میں اپنی عاطفیت اور ملک کا استحکام سمجھتے ہیں۔

دراصل اس کے اسباب ہماری ہندی مسلم تاریخ سے پروان چڑھی ذہنیت کا شاخسانہ ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں یا کم از کم ان کا اس طبقہ سے خاص تعلق ہے کہ جن کا مقصد قیام پاکستان سے قبل اور قیام پاکستان کے بعد

''طبقہ بالا اور عوام میں تفریق رکھنا اور اپنی مراعات کو مقدم رکھنا ہے۔''

1955ء میں گورنر غلام محمد کا دستور ساز اسمبلی کو توڑ دینے کا اقدام اور اس فیصلے کو عدلیہ کی توثیق مل جانے کے بعد کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔

1958ء، 1967ء، 1973ء، 1977ء، 1985ء، 1990ء، 1993ء، 1996ء، 1999ء، اور پھر 2002ء ہمارے سامنے ہے۔

غلام محمد، جنرل اسکندر مرزا، جنرل ایوب خان، جنرل یحییٰ خان،
''ذوالفقار علی بھٹو''
جنرل ضیاء الحق، محمد خان جونیجو،
''محترمہ بے نظیر بھٹو''
میاں نواز شریف، جنرل پرویز مشرف، میر ظفر اللہ خان جمالی، تولت عزیز
نیز عبوری ادوار
غلام مصطفیٰ جتوئی، معین قریشی، بلخ شیر مزاری، معراج خالد اور چوہدری شجاعت حسین۔

لوک قلم اور ضمیر آدمیت کو ملحوظ خاطر رکھ کر تاریخ سے ہمیں استدلالی اور منطقی نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی ابہام نہیں اور نہ ہی کلام ہے کہ

''سول سوسائٹی کی مضبوطی، فیصلہ ساز پارلیمنٹ، عوام کی نچلی ترین سطح تک با اختیاریت کی مضبوطی، سول سوسائٹی کی بالادستی اور جمہور پاکستان کو شعور جمہوریت''۔

قیام پاکستان اور قائداعظمؒ کے بعد قائد عوام شہید ذوالفقار علی بھٹو نے دیا۔

www.bhutto.org

سول سوسائٹی کی مضبوطی اور سول سوسائٹی کے حقوق کے لیے مسلم ہندی تاریخ سے لے کر قیام پاکستان کے 20 سال تین ماہ 15 دن کے بعد تک کوئی خاطر خواہ پیش رفت نہ ہو سکی۔ جبر کو خاموشی سے برداشت کرنا عوام کا مقدر بن چکا تھا۔ رجعت پسندوں اور مفاد پرستوں نے مجبور عوام کا استحصال جاری رکھا ہوا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو نے مظلوم و بے بس عوام کے لیے انقلابی سیاست کی طرف پیپلز پارٹی کی صورت پیش قدمی کی۔ پیپلز پارٹی جس کا منشور یہ طے پایا۔

(۱) اسلام ہمارا دین ہے۔ (۲) جمہوریت ہماری سیاست ہے۔ (۳) سوشلزم ہماری معیشت ہے۔ (۴) طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔

یہ وہ وقت تھا کہ جب پاکستان میں سول سوسائٹی اور اسٹیبلشمنٹ کی قوتوں کے درمیان اتار چڑھاؤ آ چکے تھے۔ بلاشبہ سول سوسائٹی کی جنگ ہمارے ہاں روشن خیال، ترقی پسند، محب وطن، قوم پرست اور جمہوری قوتوں نے اول روز ہی سے شروع کر دی تھی۔ ایوب خان کے مارشل لاء سے لے کر یحییٰ خان کے دور تک اس کشمکش نے پاکستان کو ادھ موا کر دیا تھا اور ملک دو حصوں میں بٹ گیا۔ اس وقت پہلی بار اسٹیبلشمنٹ نے سول سوسائٹی کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ کیونکہ ان کی طاقت شکست کھا چکی تھی اور دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی۔ اب ان کے سامنے ماسوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ "وقتی" طور پر سول سوسائٹی کے لیے کام کرنے والی قوتوں کو آگے آنے دیں۔ ایسا اسٹیبلشمنٹ نے خلوص نیت اور خوش دلی سے نہ کیا تھا۔ بلکہ اس کی بنیادی وجہ ان کی مجبوری تھی۔

تقریباً ایک لاکھ فوجی جنگی قیدی کی حیثیت سے بھارت میں مقید تھے۔ ملک دو لخت تھا اور مغربی حصہ پر بھی دشمن کی یلغار جاری تھی۔ ملک کا سارا ڈھانچہ تباہ ہو چکا تھا۔ عوام صدمے سے نڈھال بلکہ غم و غصہ میں سڑکوں پر آ چکے تھے۔

اسٹیبلشمنٹ اپنے ساتھ دائیں بازو کی رجعت پسند سوچ (ہندی مسلم اشرافیہ کا تسلسل) کو بھی لے بیٹھی۔ اسٹیٹس کی قوتیں اب بے معنی و بے وقعت ہو چکی تھیں۔ اس پس منظر اور کربناک صورتحال میں ذوالفقار علی بھٹو نئے دور کی کامیاب علامت بن کر ابھرے۔ جیسا کہ حالات و واقعات بتا رہے تھے کہ یہ سب اسٹیبلشمنٹ نے خلوص نیت اور

www.bhutto.org

خوشدلی سے نہ کیا تھا بلکہ بامر مجبوری کیا تھا جس کی واضح مثال بغاوت کی وہ کوشش تھی جو تبدیلی لانے کے خواہش مندوں نے بھٹو اقتدار کے صرف چند ماہ کے اندر اندر کر ڈالی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی ذہانت معاملے کو بھانپ گئی۔ فوج اور فضائیہ کے نئے سربراہ جنہیں بھٹو صاحب نے خود مقرر کیا تھا اور جو مذکورہ تبدیلی کے سب سے بڑے حامی سمجھے جاتے تھے۔ منظر سے ہٹا دیے گئے۔ جنرل گل حسن اور ایئر مارشل عبدالرحیم کی برطرفی کا یہی مطلب تھا۔

اسٹیبلشمنٹ کو واپس آنے کی جلدی تھی۔ لیکن اسی دور میں ملک کی صورت حال یکسر بدل چکی تھی۔ پہلی مرتبہ اسٹیبلشمنٹ سول سوسائٹی سے ڈائیلاگ کرنے پر مجبور ہوئی۔ دونوں کے کردار (رول) کا تعین ہوا، نیا آئین مرتب ہوا جو اتفاق رائے سے تیار کیا گیا، یہ آئین جمہوری بھی تھا اور پارلیمانی بھی، دو (۲) ایوانوں پر مبنی ایک وفاقی حکومت کی ضمانت دیتا ہے۔ اس پر تمام وفاقی، جمہوری، قوم پرست قوتوں کا اتفاق تھا آئین بنانا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی جس کام کو نسل کئی برس نہ کر سکی ہو اور نسل بھی وہ جو پاکستان بنانے کی دعویدار ہو جس نے پاکستان بنایا تھا۔ اُسے بھٹو نے ایک ڈیڑھ سال اور نامساعد حالات میں جب ملک دولخت ہو چکا تھا کر دکھایا۔ قوموں میں آئین قوموں کی عظمت ہوتا ہے اور 73ء کا آئین اور اس کی عظمت کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ آج بھی یہ آئین جمہوری قوتوں کا نصب العین ہے۔ اس آئین کے ساتھ ہی ملک میں پہلی بار عوام کی طاقت سے اقتدار کی ہیت ترکیبی طے ہوئی۔ اداروں کی تشکیل کی گئی مزید یہ کہ صوبائی خودمختیاری کے مسئلے کا فیصلہ کیا گیا۔

اس کے ساتھ ہی پارلیمنٹ کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کیا گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر بھٹو صاحب نے ملک کی ترقی اور تعمیر کے کام شروع کر دیے۔ ملک آئین ہی نہیں دیا بلکہ اسے ایٹمی طاقت بنانے کی مضبوط بنیاد بھی رکھی جو آخر کار ایٹمی قوت بننے پر ہی منتج ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب ملک کا خزانہ اس حد تک خالی تھا کہ جس میں ایک ہفتے کا بھی زر مبادلہ نہ تھا۔ ہمارے سپاہی دشمن کے قبضے میں تھے اور وطن عزیز کا اچھا خاصا علاقہ بھی۔

بھٹو نے اپنی معاملہ فہمی، دور اندیشی اور کمال ہنرمندی سے سپاہی اور مقبوضہ علاقہ دونوں دشمن سے واپس لیے۔ یہ وہ وقت تھا جب قوم مایوس تھی۔ اُسے حوصلہ دیا کئی ایسی

www.bhutto.org

حقیقتیں تھیں کہ جن کو ذوالفقار علی بھٹو تسلیم نہ کرتے تو آج نجانے ہم کئی الجھنوں اور فکری مغالطوں کا شکار ہوتے۔ یہ صرف عوام کا اعتماد اور بھٹو کی صلاحیتوں پر عوام کا یقین تھا کہ انڈیا جا کر بھٹو نے شملہ معاہدہ کیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کا اسلامی کانفرنس کا انعقاد تاریخی کارنامہ ہے جس سے مسلم امہ میں ایک نیا ولولہ پیدا ہوا۔ اس عہد میں پاکستان کی ''غیر جانبدار'' تحریک سے وابستگی بھی مضبوط ہوئی۔ پہلی بار تیسری دنیا کے اتحاد کو ایک معاشی، سیاسی، ترقیاتی اور اخلاقی تصور کے طور پر پیش کیا گیا۔ تیسری دنیا اور مسلم ممالک میں پاکستان کا تشخص واضح طور پر سامنے آیا۔ پاکستانی عوام کے لیے ان ممالک بالخصوص خلیج کے علاقے سعودی عرب اور لیبیا وغیرہ میں بے شمار مواقع نکلے۔ ہمارے محنت کش و مزدور طبقہ انٹرنیشنل پاسپورٹ حاصل کر سکا اور دنیا بھر میں اپنی خدمات کے عوض نہ صرف اپنی زندگیوں کو بلکہ ملک کی معیشت کو خوشحال بنانے میں لگ گئے۔ یہ ایک انقلاب تھا۔

ملک کے سماجی اور بالخصوص معاشی حالات بدل رہے تھے۔ باہر جا کر کمانے والے اسٹیبلشمنٹ کی گرفت سے قدرے آزاد تھے۔ یہی وہ دور تھا کہ جب اسٹیل ملز اور پورٹ قاسم کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اب جبکہ ملک خوشحالی و ترقی کی طرف گامزن تھا اور لوگوں کی سوچ کا ارتقائی عمل تیز سے تیز تر ہو رہا تھا۔ جو قیام پاکستان کے بعد پہلی بار بھٹو صاحب نے کر دکھایا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات اسٹیبلشمنٹ کے لیے قابل قبول نہ تھی کیونکہ اب اسٹیبلشمنٹ کو بھی یقین ہو چلا تھا کہ ملک پر اس کی گرفت کمزور ہو چکی ہے اور ملک اس کے ہاتھ سے نکل رہا ہے کس طرح سے کمزور گرفت کو مضبوط کیا جائے؟ منصوبہ بندی شروع کر دی گئی۔

اسی دوران پی این اے کی تحریک شروع ہوئی جو دراصل آئین اور جمہوریت کی تحریک تھی۔ جہاں جمہوریت ہو وہاں اس طرح کی تحریک اٹھا کرتیں ہیں اور پھر یہ بھٹو صاحب کا دور تھا کہ جس میں مزدور، محنت کش، طالب علموں اور سول حقوق کے علمبرداروں نے جب چاہا آواز اٹھائی اختلاف رائے جمہوریت کی سانس کے مترادف ہے۔ یہ بات اب کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ پی این اے کی تحریک کو کس طرح سے ہائی جیک کیا گیا۔ پی این اے تحریک پر نظام مصطفیٰ کا لیبل لگا کر دائیں بازو کی قوتوں کہ جن کی پشت پر اسٹیبلشمنٹ کا

www.bhutto.org

ہاتھ تھا نے اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ سب کچھ سول سوسائٹی کو کمزور کرنے کے لیے، ملک کی پروگریسو، لبرل اور بائیں بازو کی قوتوں کو نقصان پہنچانے کے لیے کیا گیا۔ یقیناً ایسا کرنے والے اس قدر سادہ نہ تھے کہ انہیں اس بات کی خبر نہ تھی کہ اس طرح وہ ملک کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ بھٹو نے اس تحریک کا رُخ بدلنے کی کوشش کی۔ آخری لمحے جبکہ پی این اے سے معاہدہ طے پا چکا تھا۔

فوج نے اقتدار سنبھال لیا۔ اب تو یہ بات بھی ریکارڈ پر آ چکی ہے کہ وہ کون لوگ تھے جو پی این اے کے اندر اپنے ساتھیوں کو باور کرا رہے تھے۔ معاہدہ نہ کرو، فوج کو آنے دو، یہ 90 نوے دن میں انتخاب کروا کر چلے جائیں گے یہ بھی ہوا کہ تحریک کے عروج پر مسلح افواج کے سربراہوں کے نام تحریک کے ایک اہم قائد نے خط لکھے اور انہیں مداخلت کی دعوت دی یہ بھی کہا گیا کہ ہم بھٹو کو پھانسی دیں گے۔ جب تین شہروں میں امن قائم کرنے کے لیے مارشل لاء لگایا گیا تو اس کی مخالفت نہ ہوئی بلکہ مطالبہ کیا گیا" آدھا نہیں پورا مارشل لاء نافذ کیا جائے اور پھر مارشل لاء لگ گیا۔ 90 نوے دن میں انتخابات کا وعدہ ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ وقت مقررہ پر انتخابات کرانے کے اعلان کو پہلے احتساب پھر انتخاب کے نعرے سے بدل دیا گیا۔ اصغر خان ایران کے دورے سے واپسی کے بعد تحریک سے الگ ہو گئے۔ پی این اے کی جماعتیں فوجی حکومت میں شامل ہو گئیں۔ بھٹو صاحب کو پھانسی دینے کی سازش شروع ہو گئی جو دراصل لبرل اور پروگریسو پاکستان ۔۔۔۔۔ کو ختم کرنے کی سازش تھی۔

یہ حقیقت اب واضح ہو چکی ہے کہ جنرل ضیاء الحق کو شہید بھٹو کی حکومت ختم کرنے اور انہیں پھانسی کے تختے پر چڑھانے کی جرأت کیوں ہوئی؟ اول تو یہ کہ بھٹو تیسری دنیا کو اس کے وسائل کے ساتھ متحد کر کے، مشترکہ اقتصادی اور سیاسی پالیسیاں بنانے کی راہ پر چلا رہے تھے۔ دوسرے اسلامی ممالک کا علیحدہ اتحاد بنانے میں مصروف تھے۔ 1973ء میں تیل کا ہتھیار استعمال کر کے عرب دنیا میں ایک نیا اعتماد آ گیا تھا اور ترقی یافتہ ملکوں کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کی صنعتی ترقی کی معیشت تیل کے بغیر کیا رہ جائے گی۔ یہ ان کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اگر تیل کے ساتھ اس کے ذخیروں کی حفاظت کی اہلیت بھی عرب ملکوں میں پیدا ہو جاتی تو ترقی یافتہ ملکوں کی شہ رگ عربوں کے ہاتھ میں آ سکتی تھی۔

www.bhutto.org

یہ راز بھٹو ہی جانتے تھے انہوں نے عرب ملکوں کے قائدین کو اس سے آگاہ بھی کر دیا تھا۔ انہی میں سے بعض کے تعاون سے انہوں نے پاکستان کا ایٹمی پروگرام شروع کیا۔ سرمایہ دار ممالک جان گئے تھے کہ یہ اصل میں کیا چیز ہے؟

پاکستان کی جوہری طاقت عربوں کے تیل کی حفاظت کا ذریعہ بن کر دنیا کے سیاسی اور اقتصادی نقشے کو بدل سکتی تھی۔ مغرب کے لیے یہ صورت حال ایک ڈراؤنے خواب کی طرح تھی۔ اسی لیے ایٹمی ری پروسسنگ پلانٹ کا جو منصوبہ انہوں نے تیار کیا تھا وہ امریکیوں کو پسند نہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی شہ رگ پر ہاتھ رکھنے کے علاوہ اسلامی ممالک اسرائیل کی تباہی کے قابل بھی ہو جائیں گے۔ بھٹو، بھارتی بورژوازی کی سپر طاقت بننے کی حکمت عملی کے سامنے بھی سر نہیں جھکا رہے تھے۔ دوسری طرف امریکیوں کی ہمیشہ سے یہ پالیسی رہی تھی کہ پاکستان بھارت کے خلاف کبھی کوئی قدم نہ اُٹھائے اور امریکہ سے ملنے والی فوجی امداد صرف سوشلسٹ بلاک کے خلاف استعمال کرے اور خلیج میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے تیل کے مفادات کی حفاظت کرنے والا سپاہی بنا رہے۔

امریکیوں کو اس بات کا پتہ تھا کہ بھٹو کے نیشنل ازم کی کامیابی سے پاکستان اقتصادی طور پر خود کفیل ملک بن جائے گا اور امریکی مفادات کا محافظ سپاہی بننے سے انکار کر دے گا۔ امریکی اس بات کو بھی جانتے تھے کہ بھٹو شہید بار بار افریقہ کے حریت پسند عوام کی حمایت کیوں کر رہے ہیں۔ اس لیے اب بھٹو امریکی انتظامیہ کے لیے ایک مسئلہ بن چکے تھے۔ امریکہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ہر قیمت پر بھٹو اور ان کے نظریات کو ختم کرنے کے لیے پاکستانی عوام کو ان کی قیادت سے محروم کر دیا جائے۔ اسی مقصد کے لیے جماعت اسلامی اور اس کی سرپرست بادشاہتوں کے ذریعے جنرل ضیاء الحق کو چیف آف آرمی سٹاف بنوایا گیا۔

یہی جنرل 1970ء میں اردن میں فلسطینی تنظیم آزادی کے مجاہدین کے قتل عام میں اہم کردار ادا کر چکا تھا۔ اس تقرر پر بھٹو کے قریبی دوست یاسر عرفات نے انہیں انتباہ بھی کیا تھا۔ بھٹو نے جب ری پروسسنگ کے پلانٹ کے منصوبے پر عمل شروع کر دیا تو امریکیوں نے بھی ان پر آخری وار کرنے کی اسکیم تیار کر لی۔ شہید بھٹو اسے بھانپ گئے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی حکومت کی عمر ختم ہونے سے پہلے الیکشن کروا لیے جائیں اور

www.bhutto.org

بیگم نصرت بھٹو

www.bhutto.org

عوام کی مدد سے کامیاب حکومت بنا کر امریکہ اور اس کے پاکستانی ایجنٹوں کو شکست دے دی جائے۔ لیکن امریکہ نے آناً فاناً جماعتوں کا اتحاد (پاکستان نیشنل الائنس) قائم کروادیا۔

اس اتحاد نے نظام مصطفیٰؐ کا بظاہر نعرہ لگا کر پاکستان کی مڈل کلاس کو سامراجی مال کے درآمد کنندگان تاجروں، جاگیرداروں، سرکاری افسروں اور سرمایہ داروں کی مدد سے میدان میں اُتار لیا۔ اتحاد کے سارے عناصر سازش میں شریک نہیں تھے۔ اکثریت جمہوری آزادیوں کے فروغ کے لیے کام کر رہی تھی لیکن اس جمہوری تحریک کو نظام مصطفیٰؐ کے نعرے کی آڑ میں قوم پرست قیادت کے خاتمے کی طرف موڑ دیا گیا۔ پاکستان کے اسی فیصد غریب عوام اگرچہ بھٹو کے ساتھ تھے اور انہوں نے 1977ء میں شہید بھٹو کو ووٹ دے کر الیکشن میں فتح بھی دلا دی تھی لیکن پیپلز پارٹی کے ووٹر ایک منظم تحریک کی صورت اس لیے اختیار نہ کر سکے کہ اس میں بہت سے موقع پرست، دولت مند اور مڈل کلاسئے بھی شامل تھے۔ مڈل کلاس میں فاشزم کا رجحان موجود ہوتا ہے۔ اسے مذہبی جنون کے ذریعے ابھار کر بھٹو کے خلاف استعمال کیا گیا جبکہ پیپلز پارٹی کے محنت کش ایک تحریک میں منظم نہ ہونے کی وجہ سے اس فاشٹ جنون کے مقابلے میں نہ آئے۔ پروپیگنڈہ یہ کیا گیا کہ عوام بھٹو کے ساتھ نہیں ہیں۔ 1977ء میں جو ایجی ٹیشن بھٹو شہید کے خلاف شروع ہوا اس کی بنیاد کئی برس پہلے رکھی جا چکی تھی۔ اُس پر باقاعدہ عمل اس وقت شروع کیا گیا جب 1976ء میں امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے پاکستان کا دورہ کیا اور شہید بھٹو کو واضح طور پر دھمکی دی کہ امریکہ ان کو عبرت ناک مثال بنا دے گا۔

یہ 10 اگست 1976ء کی بات ہے اس روز ہنری کسنجر لاہور آئے اور شہید بھٹو نے ان کو عشائیہ دیا۔ اس وقت کسی کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ ہنری کسنجر نے کیا بات کی۔ بہت دنوں بعد یہ راز کھلا کہ بھٹو کو دھمکی دی گئی تھی کہ اگر انہوں نے فرانس سے کئے گئے ری پروسسنگ ایٹمی پلانٹ کے معاہدے سے دستبردار ہونا قبول نہ کیا تو ان کو عبرت ناک مثال بنا دیا جائے گا۔ تاریخ نے صداقت کا ساتھ دیا۔ دیکھئے کہ جس بھٹو کو ایٹمی پلانٹ کی وجہ سے شہید کیا گیا اس کی بیٹی کے دور میں فروری 1990ء میں فرانس کے صدر متراں نے خود پاکستان میں آکر ایٹمی پلانٹ دینے کا اعلان کیا اور اسی فروری 1990ء میں بھٹو کی بیٹی نے افواج پاکستان کے زیر اہتمام شائع ہونے والے جریدے میں ''پاکستان ڈیفنس جرنل'' کو

www.bhutto.org

انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ''اسی ایٹمی پلانٹ کو روکنے کے لیے ان کے والد کی حکومت ختم کی گئی تھی اور اسی پلانٹ کو روکنے کے لیے جنرل ضیاء نے بار بار الیکشن ملتوی کیے تھے۔ یہ پاکستان کے عوام کی بدنصیبی تھی کہ بھٹو جیسا لیڈر اس پلانٹ کے باعث پھانسی چڑھ گیا لیکن یہ انہی عوام کی خوش نصیبی ہے کہ اسی شہید لیڈر کی بیٹی نے اسی فرانس کے ساتھ وہی پلانٹ لگانے کا معاہدہ کیا۔ جس سے 1977ء میں فرانس منحرف ہو گیا تھا۔''

10 اگست 1976ء کو جب ڈاکٹر ہنری کسنجر نے بھٹو کو عبرت ناک مثال بنا دینے کی دھمکی دی تو بھٹو نے اسی رات لاہور میں کسنجر کے اعزاز میں دیئے گئے عشائیے میں وہ عظیم تقریر کی جو فلسفہ سیاست اور لٹریچر میں کلاسیک بن چکی ہے۔ اس تقریر سے ہی ثابت ہو گیا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو کی جسمانی زندگی اگر ختم بھی کر دی گئی تو یہ شخصیت ایک تاریخ ساز کردار کی صورت میں صدیوں تک لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر چھائی رہے گی۔ انگریزی زبان میں کی جانے والی بھٹو شہید کی تقریر کا پورا اردو ترجمہ یہاں اس لیے پیش کیا جا رہا ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ میں جہانِ معنی پنہاں ہیں۔ تقریر کے پہلے دو رسمی جملے پڑھنے کے بعد دیکھئے کہ عالمی ڈپلومیسی سے لے کر تاریخ ساز نظریاتی موقف اور اپنے عزم کو پیش کرتے ہوئے شہید بھٹو نے کیا کچھ کہہ دیا تھا۔ پہلے دو جملے تو یہ ہیں۔

''خواتین و حضرات!

ہمارے لیے یہ باعث مسرت و اعزاز ہے کہ امریکہ کے وزیر خارجہ ایک بار پھر ہمارے ساتھ مذاکرات کے لیے تشریف لائے ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ کل صبح لاہور میں ہونے والے مذاکرات حوصلہ افزاء ثابت ہوں گے۔''

ان دو جملوں کے بعد شہید بھٹو نے کہا تھا۔

''مسٹر ڈاکٹر کسنجر میں بڑے دکھ کے ساتھ آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ شہر لاہور پر سیاہ بادل منڈلا رہے ہیں اور یہ صرف شہر لاہور پر ہی نہیں منڈلا رہے ہیں بلکہ گزشتہ دس بارہ دنوں سے ملک کے بیشتر حصوں پر ان کا سایہ ہے۔ ہم نے بہت سی ہولناک تباہیاں دیکھی ہیں۔ اب ہم ایک انتہائی نازک اور تشویش ناک دور سے گزر رہے ہیں کیونکہ ہمارے دریاؤں میں پانی چڑھا ہوا ہے اور وہ بہت شرارتیں کر رہے ہیں۔ وہ ہنگامہ خیزی پر اُتر آئے ہیں اور ہم ان پر ایک کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ وادیٔ سندھ کی پانچ ہزار سالہ

www.bhutto.org

قدیم تہذیب کسی نہ کسی طور سے اپنے دریاؤں کے ساتھ زندگی کرتے اور ان سے نبرد آزما رہتے ہوئے گزری ہے۔ ہمیں بعض اوقات ان دریاؤں سے لڑنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات ان کو ٹھنڈا کرنے کے لیے، بعض اوقات ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اور بعض اوقات ان کی ناز برداریاں کرنے کے لیے اور دریاؤں سے اسی طرح نمٹ کر ہی ہم نے ڈپلومیسی سیکھی ہے۔ قدرت کے بدلتے تیوروں سے پیش آنے کی طرح ہی ڈپلومیسی میں بدلتے ہوئے حالات سے نمٹنا مضمر ہوتا ہے۔ اس طرح کے تجربات سے گزرنے والے عوام کے لیے ڈپلومیسی فطری عمل بن جاتی ہے۔ ایسا ان لوگوں کے ساتھ نہیں ہوتا جو دریاؤں کو رام نہیں کرتے ان سے جنگ نہیں کرتے، ان کے ساتھ وصال نہیں کرتے۔

اس لیے کل صبح جب آپ ہم سے مذاکرات کریں گے تو براہ مہربانی آپ یاد رکھیں کہ ہماری ڈپلومیسی کل اپنے عروج پر ہو گی کیونکہ اس وقت ہمارے دریا شرارتوں سے بھرپور ہیں اور چونکہ روڈیارڈ کپلنگ بھی لاہور میں رہتے رہے ہیں اور مشہور اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کے ایڈیٹرز ہیں اس لیے آپ لاہور کو صرف مسٹر کیم اور کپلنگ سے ہی وابستہ نہ کریں اگرچہ کیم اور کپلنگ کا برطانوی راج سے بہت واسطہ تھا جس کے بعض نقوش آج بھی اِدھر اُدھر آپ کو نظر آئیں گے۔ ہمارے تمام شہروں میں لاہور ہمارا ایک ثقافتی مرکز ہے۔ یہ ہماری تاریخ کا محور اور ہماری سرگرمیوں کا منبع رہا ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس نے صدیوں قبل اپنا مقام بنا لیا تھا۔ اس شہر نے بہت فاتح دیکھے ہیں۔ اس شہر سے ہماری کئی نشاۃ ثانیہ وابستہ ہیں۔ اس شہر کی عظمت ہمارے لیے باعث فخر ہے اور حالیہ زمانوں میں جب لاہور پر چڑھائی کی گئی تھی تو اس شہر کے جیالے عوام نے جارحیت کرنے والوں کو بڑی بہادری سے پسپا کر دیا تھا اور اپنی دھرتی کے ایک ایک انچ کے تحفظ کے لیے جوانمردی سے مقابلہ کیا تھا۔

لاہور کئی اعتبار سے ہمارے دلکش اور مسحور کن احساسات کا گہوارہ رہا ہے۔ یہ باغوں کا شہر ہے، یہ قلعوں کا شہر ہے، یہ ایک تاریخی شہر ہے، یہ تاریخی مساجد کا شہر ہے اور یہاں اسی شہر لاہور میں ایک مغل بادشاہ بھی رہتا تھا جس کا شہزادہ ایک خوبصورت نوجوان لڑکی انارکلی کی محبت میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ انارکلی، انار کے درخت کے ایک کھلتے ہوئے پھول کی مانند تھی لیکن شہزادے کا باپ بادشاہ اکبر یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا انارکلی سے

www.bhutto.org

شادی کرے۔ اس نے اسے سزا دینے کی غرض سے زندہ دفن کر دیا اور اسی قبر کے نزدیک ہمارا سیکرٹریٹ ہے جہاں ہم اَن تھک محنت کرتے ہیں اور تمام فائلوں کو یہیں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہاں سے ٹھیک اس کمرے کی دوسری جانب اگلے دروازے کی طرف جہاں مذاکرات کریں گے، اسی میدان میں دو افراد اپنی غلط مہمات کی وجہ سے دفن ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مغل بادشاہوں نے، بدھ شہنشاہوں نے اور راجہ رنجیت سنگھ جیسے حکمرانوں نے اور بہت سے دوسرے لوگوں نے اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔

میں خود ذاتی طور پر بھی اس شہر سے بہت متاثر ہوں۔ مجھے ہمیشہ اس شہر سے گہری عقیدت رہی ہے اور میں اس شہر کو اس لیے بھی پسند کرتا ہوں کہ میں نے 1970ء میں اس شہر سے بھی الیکشن لڑا تھا (میں نے بیک وقت پانچ دوسرے شہروں سے بھی انتخاب لڑا تھا) اور میں لاہور میں صرف ایک دن کے لیے آیا تھا اور مجھے فخر ہے کہ میں نے چالیس ہزار ووٹوں سے ایک ایسے شخص کو شکست دی تھی جس کے باپ نے پاکستان کا تصور پیش کیا تھا۔ لہٰذا لاہور کے لوگوں کی مجھ پر بہت سی نوازشیں اور مہربانیاں رہی ہیں اور میں بھی دل سے ان کا ممنون ہوں۔ اس لیے ہم سوچتے تھے کہ آپ جب پاکستان آتے ہیں تو ہمیشہ اسلام آباد میں آتے ہیں اور صرف ایک بار ہی لاہور میں آئے ہیں جبکہ ہمارا خیال تھا کہ آپ لاہور بھی آئیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ مسز کسنجر کے پاس اتنا وقت ہوگا کہ وہ کل صبح اس خوبصورت شہر کے بھی دلکش مقامات کی سیر کر سکیں۔ شاید وہ کوشش کریں، آپ ہمارے مہمان ہیں اور ہمارے درمیان کوئی تکلف نہیں ہے۔ اگر آپ تھک گئی ہوں تو دوبارہ آسکتی ہیں۔ پاکستان میں تو آپ کا ہمیشہ خیر مقدم کیا جائے گا۔

ڈاکٹر ہنری کسنجر، مسز کسنجر اور آپ کے خاندان کو ہمارے ملک میں ہمیشہ خوش آمدید کہا جائے گا۔ خواہ کسی بھی حیثیت سے پاکستان آئیں ہم ان کا کھلے دل سے خیر مقدم کریں گے کیونکہ ہمارے دل میں ان کے لیے بے حد محبت اور عقیدت موجود ہے۔ وہ اس لیے نہیں کہ آپ ایک ممتاز شخصیت کے حامل ہیں اور نہ اس لیے کہ ڈاکٹر ہنری کسنجر اپنے ملک کی خارجہ پالیسی کی تشکیل نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں اور جس کے لیے مجھے امید ہے کہ امریکی عوام بھی آپ کو بھرپور خراجِ تحسین پیش کرتے ہوں گے بلکہ اس کے لیے کہ ڈاکٹر کسنجر تاریخ پر مکمل گرفت رکھتے ہیں۔ موجودہ واقعات جس اعتبار سے حرکت کر رہے

www.bhutto.org

ہیں وہ ان سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ انہیں حکمت عملی کا بھی کلی طور پر علم ہے۔ وہ اس بارے کسی غلط پالیسی میں جانا بھی نہیں چاہتے ہوں گے۔ وہ ہمیشہ واضح سمت کا تعین کرتے ہیں اور عالمی امور اور خارجہ پالیسی میں ان کا ایک منفرد مقام ہے اور جب میں یہ کہتا ہوں تو میں صرف ڈپلومیسی کی خاطر نہیں کہتا کیونکہ ہمارے دریاؤں نے ہمیں اس قسم کی ڈپلومیسی نہیں سکھائی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ امریکہ کے بہت سے وزرائے خارجہ سے ملا ہوں۔ میرے دل میں ان سب کے لیے عزت و احترام موجود ہے۔ کیونکہ وہ سب امریکہ کے وزرائے خارجہ رہے ہیں۔ لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک اور عذر نہیں ہے اور میں بغیر کسی خوف و خطرے کے یہ کہوں گا کہ ڈاکٹر ہنری کسنجر! آپ کو ہم خوش آمدید کہتے ہیں۔ عالمی امن کی خاطر آپ کی گراں قدر کوششوں کو ہم قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آپ نے اَن مٹ نشانات چھوڑے ہیں کہ مستقبل کے مؤرخ بھی آپ کو خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

جناب! اس عام رسمی گفتگو سے قطع نظر، میں آپ سے ایک بات کہنا چاہوں گا اور وہ یہ کہ آپ ایران سے آ رہے ہیں۔ ایران پاکستان کا ایک ہمسایہ اور برادر ملک ہے۔ ہماری آزادی کے وقت ہی سے اس ملک کے ساتھ ہر شعبہ ہائے زندگی میں ہمارے قریبی تعلقات رہے ہیں اور آپ کابل سے بھی آ رہے ہیں اور ہم افغانستان کے ساتھ خوشگوار دوستانہ تعلقات کے قیام کے لیے بھرپور کوششیں کر رہے ہیں۔ جب افغانستان کے صدر محمد داؤد ماہِ رواں کے دوران پاکستان آئیں گے تو پاکستان خلوصِ دل کے ساتھ دونوں ملکوں کے درمیان موجود رشتوں میں دشواریوں پر قابو پانے کی کوشش کرے گا۔ آپ نے دورۂ ایران کے دوران زبردست کامیابیاں حاصل کی ہیں۔

آپ نے امریکہ اور ایران کے پہلے سے قریبی تعلقات کو مزید خوشگوار خطوط پر استوار کیا ہے اور آپ نے اس خطے کی سلامتی کے لیے ایران کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ یہ بات تسلیم کر لی گئی۔ پاکستان، ایران کی سلامتی کو اپنی سلامتی تصور کرتا ہے اور ایران بھی اپنی سلامتی کو پاکستان کی سلامتی سے علیحدہ نہیں سمجھتا۔ چھوٹے موٹے معاملات تو رونما ہوتے ہی رہتے ہیں، لیکن اگر کوئی بڑی بات ہوئی تو امریکہ ایران کی سلامتی کو پاکستان

www.bhutto.org

کی سلامتی سے علیحدہ کرنے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا تھا۔ ان کی بہتری ہماری بہتری ہے اگر امریکہ ایران کی سلامتی کو اتنا اہم تصور کرتا ہے تو پاکستان کی سلامتی کے بارے میں اس قسم کے تصور کے بغیر سلامتی کا پورا نظریہ منہدم ہو جائے گا۔ اس حقیقت سے چشم پوشی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ امریکہ کی سلامتی کے انتظامات کے احساس کے پورے نظریہ کی ایک کڑی آزمائش ہو گی۔ پاکستان ہمسایہ ممالک کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے کے عمل سے گزر رہا ہے۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ اگر بڑے ممالک کے ساتھ مفاہمت ہو سکتی ہے تو چھوٹے ممالک کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟

لیکن اس مفاہمت کے لیے ضروری ہے کہ بنیادی تنازعات طے ہونے چاہییں۔ بھارت کے ساتھ کشمیر کے بنیادی مسئلے کو جموں و کشمیر کے عوام کے حق خود اداریت کی بنیاد پر حل کیا جانا چاہیے۔ مسئلہ کشمیر کا کوئی دوسرا مناسب اور پائیدار حل نہیں ہو گا۔ بنیادی تنازعات پر سودے بازی سے زبردست پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بنیادی معاملات پر اس قسم کی گھٹیا سودے بازی کی کوشش کرنے والے فریب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب کوئی ضد یا تعصب نہیں ہے جبکہ اس کے برعکس پاکستان صرف تاریخی حقائق و شواہد اور استدلال پیش کرتا ہے۔ بنیادی معاملات پر سودے بازیوں سے مزید الجھن اور گڑبڑ پیدا ہوتی ہے۔ ہم صبح جو مذاکرات کرنے جا رہے ہیں ان کے بنیادی نکات کی وضاحت میں نے آج کر دی ہے۔

آخر میں، میں پھر لاہور کا ذکر کروں گا جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ یہ سرگرمیوں کا مرکز ہے یہ پاکستان کا دل ہے، یہ وہ شہر ہے جو ہماری سیاست کے اُتار چڑھاؤ اور ہماری ثقافتی اور اقتصادی سرگرمیوں کا گہوارہ ہے۔ جناب! یہ وہ شہر ہے جہاں ہم اپنے آپ کی ری پروسسنگ کر رہے ہیں۔ یہ ہمارا ری پروسسنگ سنٹر ہے اور ہم کوئی ایسی بات نہیں کر سکتے جس سے پاکستان کی ری پروسسنگ کے مرکز پر اثرات مرتب ہوں۔"

شہید بھٹو کی اس تقریر کا تجزیہ کرنے لگیں تو کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ اس کے نفسیاتی معنی کیا تھے؟ عالمی ڈپلومیسی میں اس کے کیا کیا مفاہم تھے؟ اور ملک کے اندرونی معاملات میں امریکہ اپنے پالتو طبقوں کے ذریعے کیا کیا منصوبے بنا رہا تھا۔ جس کا شہید بھٹو کے ذہن میں ایک خاکہ موجود تھا اور انہیں علم تھا کہ ان کے خلاف ایجی ٹیشن کا مرکز

www.bhutto.org

لاہور کو ہی بنایا جائے گا اور پنجابی سندھی تعصب پھیلا کر ایک طرف تو ان کی ذات کے خلاف انتقامی کارروائی کی جائے گی لیکن دوسری طرف سندھیوں میں نفرت پھیلا کر ان کے خلاف فوجی ایکشن کروایا جائے گا۔ اور یہ سب کچھ ہم نے اس لیے دیکھ لیا کہ 1983ء کی تحریک کا سرچشمہ سندھ بنا اور فوجی ایکشن بھی سندھی عوام کے خلاف کیا گیا اور پھر کراچی میں لسانی بنیاد پر جماعت اسلامی اور جی ایم سید کے پرانے شاگردوں کو جمع کر کے جنرل ضیاء الحق نے ان کی تنظیمیں خود بنوائیں جن کا مقصد سندھی نیشلوم اور پاکستانی پرولتاریت کو کچلنا تھا تاہم امریکہ اور بھٹو شہید کے درمیان اختلافات کا سب سے بڑا سبب وہ ایٹمی ری پروسسنگ پلانٹ تھا جس کے بارے میں امریکی یہ سوچ رہے تھے کہ لیبیا کے سربراہ کرنل قذافی اور سعودی عرب کے سربراہ شاہ فیصل کی امداد سے اگر بھٹو نے یہ پلانٹ لگا لیا تو مغرب کی صنعتی قوت اور اسرائیل کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اپنی اسی سوچ کی وجہ سے امریکی سامراج بھٹو شہید کی جان کا دشمن ہو گیا تھا اور پی این اے کے ایجی ٹیشن کے لیے کروڑوں روپے کی امداد دے رہا تھا۔ اس پس منظر کی تفصیل اخبارات کی خبروں سے ڈھونڈنے کی بجائے بہتر ہے کہ شہید بھٹو کی اس تقریر کو یاد کر لیا جائے جو انہوں نے نئی اسمبلی منتخب ہونے کے بعد 28 اپریل 1977ء کو اس کے اجلاس میں کی تھی۔ قومی اسمبلی کے اس اجلاس میں اپنا تاریخی خطاب کرتے ہوئے شہید بھٹو نے کہا تھا۔

موجودہ بحران ایک بین الاقوامی سازش کا نتیجہ ہے۔ آج پاکستان اہم جغرافیائی حیثیت کا حامل ہے اگر اسے نقصان پہنچا تو بہت سے عرب ملکوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ جن میں متحدہ عرب امارات، عمان اور سعودی عرب وغیرہ شامل ہیں۔ سازشی عناصر مجھے ہٹانا چاہتے ہیں۔ وہ پاکستان کی معیشت کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ملک موجودہ تحریک کے لیے بھاری رقم خرچ کر رہا ہے۔ ''ہاتھی'' نے ویت نام اور مشرق وسطیٰ پر ہمارے موقف کو تسلیم نہیں کیا۔ یہ ہاتھی مجھ سے ناراض ہے لیکن اس کا واسطہ مجھ بندۂ صحرا سے آن پڑا ہے کہ ہم نے ہی عربوں کو ہتھیار فراہم کیے۔ ہمارا سپاہی اسلام کا سپاہی ہے۔ ہم نے ایٹمی پلانٹ پر قومی مفاد کے مطابق موقف اختیار کیا ہے۔ ملک میں غیر ملکی کرنسی پانی کی طرح بہائی جا رہی ہے۔ بعض بیرونی اخبارات نے لکھا ہے کہ اب مزدور بھی جو اس حکومت کے حامی تھے، زبردست خلاف ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے غریب ملک میں اگر اس طرح

www.bhutto.org

رقم پھیلائی جائے جس طرح یہاں پھیلائی گئی ہے تو اس سے کون متاثر نہیں ہوگا۔ یہ کوئی راز نہیں ہے کہ کس طرح پاکستان میں پانی کی طرح رقم بہائی گئی ہے اور کس طرح غیر ملکی کرنسی سیلاب کی طرح یہاں پھیلی ہے کہ کراچی میں ڈالر چھ سات روپے کا ہو گیا ہے۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔ کس طرح لوگوں کو اذانیں دینے کیلئے رقم دی گئی، کس طرح لوگوں کو جیل جانے کے لیے رشوتیں دی گئیں۔ حتیٰ کہ دودھ والوں اور ڈاکیوں کو بھی رشوت دی گئی۔ بڑے بڑے صنعتکاروں نے یقیناً پی این اے کی حمایت کی لیکن اتنا پیسہ تو وہ بھی خرچ نہیں کر سکتے جو رقم پاکستان میں پانی کی طرح بہائی جا رہی ہے یہ رقم کس پراسرار طریقے سے پاکستان میں آئی ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی سازش ہے۔

عزیز احمد نے اس کا ذکر ڈپلومیٹک انداز میں کیا ہے لیکن مجھے بتانے دیجیے کیونکہ چند افراد کا مستقبل کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور میرا فرض ہے کہ میں لوگوں پر واضح کر دوں کہ یہ سازش قومی اتحاد کی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ میں کسی ملک کا نام لینا نہیں چاہتا اور کسی ملک کے ساتھ تعلقات بگاڑنا نہیں چاہتا لیکن عوام کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرا قصور کیا ہے؟ میرا جرم کیا ہے جس کی وجہ سے میرے خون کے پیاسے میری جان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟ عوام کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہاتھی کا حافظہ بہت تیز ہوتا ہے اور دنیا میں ہاتھی موجود ہیں۔ دنیا میں کتنے ہیں یہ آپ جانتے ہیں۔ یہ ہاتھی زیادہ نہیں ہیں۔ ان ہاتھیوں کا ایسا حافظہ ہوتا ہے کہ وہ ماضی کو فراموش نہیں کرتے۔ یہ بھولنا نہیں چاہیے کہ ویتنام کی جنگ کے وقت جب میں پاکستان کا وزیر خارجہ تھا تو پاکستان نے کیا مؤقف اختیار کیا تھا۔ پاکستان سے اس وقت کہا گیا تھا کہ وہ غلط مؤقف رکھنے والے فریق کی حمایت کرے اور جو کچھ وہ فریق مانگ رہا ہے اگر وہ نہ دے تو کم از کم پنگ پانگ کی گیندیں اور ٹیبل ٹینس کے ریکٹ ہی روانہ کر دے، لیکن ہم نے کہہ دیا کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ بات ایک ملاقات میں کہی گئی جو ایک اعلیٰ شخصیت کے ساتھ کراچی میں ہوئی اور یہ شخصیت ''ہاتھی'' پر سوار تھی۔

اس نے کہا کہ آپ پنگ پانگ کی گیندیں اور ٹیبل ٹینس کی گیندیں بھی بھیجنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ایوب خان بھی اس ملاقات میں موجود تھے۔ وہ میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے کہا ہم کچھ بھی نہیں بھیجیں گے کیونکہ اس کا تعلق اصولوں سے ہے۔ ہم کسی

www.bhutto.org

طور پر بھی غلط فریق کی حمایت نہیں کر سکتے ۔ اس ہاتھی کے چین کے ساتھ بھی بڑے اختلافات تھے ۔ یہ وہ وقت تھا جب چین کا نام لینا بھی جرم تھا اور اس سے بعض افراد کا بلڈ پریشر تیز ہو جاتا تھا۔ چین کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کے عمل کو بھی نقصان پہنچایا گیا۔ پھر ہم نے شرق اوسط میں عربوں کی حمایت کی ۔ اس پر میں پاکستان کی ماضی کی ہر حکومت کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں ۔ قائداعظم سے لے کر اب تک ہر حکومت نے عربوں کی حمایت کی لیکن بعض وجوہ کی بناء پر یہ حمایت صرف زبانی تھی جو اعلامیوں اور اقوام متحدہ کی قراردادوں تک محدود تھی اور ہمارے عرب بھائی اس کی قدر کرتے تھے لیکن جب میں برسر اقتدار آیا تو میں نے کہا کہ اصل حمایت تو فوجی حمایت ہوتی ہے۔

میری حمایت صرف زبانی نہیں بلکہ یہ ہے کہ آپ کی (عربوں کی) جنگ ہماری جنگ ہے اور پاکستان کا سپاہی اسلام کا سپاہی ہے۔ یہ بات ان لوگوں کو پسند نہ آئی جو جارحیت کا ارتقاب کرنے والے اور جارحیت کا شکار ہونے والوں کے درمیان کوئی فرق کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ جب کہ میں نے کھل کر یہ کہا کہ سوال یہ ہے کہ عرب جارح یا صیہونی جارح ہیں؟ اور جارحیت کا شکار کون ہے، عرب یا یہودی؟ اور یہ فرق ہے ذوالفقار علی بھٹو اور دوسروں کے درمیان ۔ قومی اتحاد (پی این اے) کی جس طرح تنظیم کی جا رہی ہے اس کو قومی اتحاد کا کوئی ذہن تیار نہیں کر سکتا۔ کیا قومی اتحاد کے پاس ایسا کوئی ذہین ہے جو لوگوں کو بازاروں میں کم قیمت پر سبزیاں فراہم کر دے اور کم قیمت پر بیج تقسیم کر دے؟ کیا قومی اتحاد کے پاس ایسی کوئی تنظیم موجود ہے؟ میں صرف ایک مثال دوں گا ۔ ہمارے ملک میں ایسی باتیں کون سوچتا ہے کہ پہیہ جام کر دیا جائے۔ یہ بیرونی خیالات ہیں۔ ایوب خان سے بھی کہا گیا تھا اگر تمہارے خلاف انقلاب آیا تو اس کے جوابی اقدام کے طور پر ہم پہیہ جام آپریشن کروا دیں گے۔ اس مقصد کے لیے دو ہزار افراد بھرتی کیے گئے تھے۔ غیر ملکی ماہرین نے ان کو ریلوے اور طیارے روکنے اور پہیہ جام کرنے کے اقدامات کی تربیت دی تھی۔ جمعہ کے بعد جلوس ہڑتالیں اور مظاہرے تو ہماری سیاست میں ہوتے تھے لیکن یہ پہیہ جام باہر سے برآمد کی ہوئی چیز ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہم نے پاکستان کی تعمیر نو کی ہے اور اس حد تک کی ہے کہ 1971ء میں مجھے نیویارک میں ایک ذمہ دار شخص نے کہا تھا کہ اب پاکستان کا شمار نیپال،

www.bhutto.org

بھوٹان، بنگلہ دیش اور سکم وغیرہ کے ساتھ ہوگا اور ان ہی سے مستقبل سے اس کا تعلق ہوگا۔ کیونکہ پاکستان تو بھارت کے صوبے یوپی کے برابر بھی نہیں ہے۔ لیکن آج چھ سال بعد 1977ء میں یہ صورتحال پیدا ہوگئی ہے کہ بھارت کے وزیراعظم مرار جی ڈیسائی بھی یہ کہتے ہیں کہ پاکستان انڈیا کا بڑا اور اہم پڑوسی ہے۔ نہ صرف یہ کہ مرار جی ڈیسائی نے یہ بات کہی بلکہ یہ بھی کہا کہ بھارت پاکستان کے ساتھ برابر کے تعلقات چاہتا ہے جبکہ اس سے پہلے بھارت اس پورے خطے پر اپنی بالادستی قائم کرنے کا دعویدار تھا اور ڈاکٹر کسنجر کے دورے کے موقع پر امریکہ نے یہ تسلیم کیا تھا کہ بھارت اس علاقے کا بالادست ملک ہے۔ لیکن میں نے اس وقت بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ ہم اس سے صرف برابری کی بنیاد پر تعلقات رکھ سکتے ہیں۔ لیکن اب پاکستان اتنا مضبوط اور مستحکم ہوگیا ہے کہ بھارت نے بالادستی والا موقف ترک کر دیا ہے۔ جغرافیائی طور پر پاکستان کی پوزیشن بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ہمیں جو بھی فوائد یا نقصانات مل سکتے ہیں ان کا تعلق اسی فوجی اہمیت کی پوزیشن سے ہے۔

پاکستان کے جنوب میں بھارت ہے جو بہت بڑا ملک ہے۔ مشرق میں بھارت کے علاوہ بعض دوسرے ممالک ہیں جن میں برما، بنگلہ دیش، بھوٹان، ملائیشیا اور انڈونیشیا شامل ہیں۔ پھر مغرب میں افغانستان ہے جو اہم ملک ہے پھر ایران ہے وہ بھی ایک اہم ملک ہے۔ چین کے ساتھ ہماری 350 میل طویل سرحد ملتی ہے جو فوجی اہمیت کی سرحد ہے جہاں سنکیانگ کا حساس صوبہ ہے جو ہمارے شمالی علاقوں سے ملتا ہے۔ سوویت یونین اور پاکستان کے درمیان صرف نو میل کا سرحدی زون ہے۔ یہ کاریڈور واخان کہلاتا ہے۔ پھر مغرب میں متحدہ عرب امارات، عمان اور دوسری ریاستیں موجود ہیں۔ اسی جانب سعودی عرب ہے پھر جنوب میں بحیرۂ روم اور یونان وغیرہ ہیں۔ اس لحاظ سے پاکستان کی پوزیشن بڑی اہم ہے۔

خدانخواستہ اگر پاکستان کو کچھ نقصان پہنچا تو مشرقی محاذ، مغربی محاذ اور عرب محاذ کی طرف بہت خراب صورتحال پیدا ہوگی اور اگر پاکستان مستحکم و مضبوط ہوا تو صورتحال مختلف ہوگی۔ پاکستان کمزور ہوا تو متحدہ عرب امارات، عمان اور سعودی عرب کی پیٹھ میں چھرا گھونپا جا سکتا ہے۔ یہ ہے پاکستان کی اہمیت۔ آج جو بڑے پیمانے پر بیرونی مداخلت

www.bhutto.org

ہورہی ہے، یہ کھیل انتخابی دھاندلی کے نام پر شروع کیا گیا ہے۔ اگر دھاندلی کے خلاف لوگ ریل کی پٹریوں پر لیٹ جاتے ہیں اور سینے کھول کر کہتے ہیں کہ ہمیں گولیاں مارو تو ہم نے دھاندلی کا ازالہ کرنے کے لئے ایک طریق کار مقرر کر دیا ہے۔ پھر جہاں تک شریعت کا مسئلہ تھا ہم نے اس کے لئے اقدامات کر دیئے ہیں لیکن مولانا مودودی اور نسم ولی خان کہتے ہیں کہ یہ اصل مسئلہ ہے ہی نہیں۔ حالانکہ ان کے جنرل سیکرٹری رفیق باجوہ نے کہا تھا کہ اگر حکومت نظام مصطفیٰ لے آئے تو ہم دستبردار ہو جائیں گے۔

اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ شریعت یا دھاندلی کا نہیں اس رقم کا ہے جو ملک میں بڑے پیمانے پر بکھیری جارہی ہے۔ اب وہ میرا استعفیٰ مانگتے ہیں۔ اس وزیراعظم کا استعفیٰ جسے دوبارہ عوام نے منتخب کیا ہے۔ یہ اعزاز لیاقت علی خان، غلام محمد، ناظم الدین کسی کو حاصل نہیں رہا۔ پھر ان لوگوں نے میری پارٹی میں بھی گھسنے کی کوشش کی وزیروں اور ارکان اسمبلی کو بھی ورغلانے کی کوشش کی گئی۔ ہر بیرونی اخبار نویس سوال کرتا ہے کہ آپ کب مستعفی ہونگے؟ میں نے تو ان سے نہیں پوچھا کہ کیلیفان کب مستعفی ہونگے جو صرف ایک رکن کی اکثریت سے اور لبرل حمایت سے حکومت برقرار رکھے ہوئے ہیں اور جنہوں نے شمالی آئرلینڈ میں مارشل لاء لگا رکھا ہے وہ کیلیفان سے یا اسمتھ سے مستعفی ہونے کے بارے میں کیوں نہیں پوچھتے؟ آخر سارا نزلہ ذوالفقار علی بھٹو پر ہی کیوں گر رہا ہے؟ اس کی وجہ صرف ایک ہے کہ ہاتھی کا حافظہ بہت تیز ہوتا ہے۔

ہاتھی کو معلوم ہوتا ہے کہ میں پاکستان کے استحکام کا ستون ہوں اور اس کے استحکام کی علامت ہوں اس لئے ہاتھی مجھے ہٹانا چاہتا ہے۔ مسئلہ ایک فرد کا نہیں بلکہ مسئلہ اصل میں یہ ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کیا چاہتا ہے؟ میں نے جب اسلامی کانفرنس بلائی تو اسے ایک ماہ کے لئے ملتوی کرنے کے لئے کہا گیا۔ اسے ملتوی کر دیا گیا تو پھر مزید ایک ماہ کے لئے ملتوی کرنے کے لئے کہا گیا جو میں نے کر دی پھر جب مجھے تیسری بار یہ کانفرنس ملتوی کرنے کے لئے کہا گیا تو میں نے شاہ فیصل کو خط لکھا۔ انہوں نے مجھ سے مکمل اتفاق کیا اور کہا کہ یہ کانفرنس فروری میں ہوگی اور پاکستان میں ہوگی اور اس میں مزید التواء نہیں ہوگا۔ پھر جب اکتوبر میں ہنری کسنجر پاکستان آئے اور ان کے ساتھ میری بات ہوئی تو انہوں نے کیا کہا اور میں نے کیا جواب دیا یہ میں نہیں بتاؤں گا۔ وہ خود کتاب

www.bhutto.org

لکھ رہے ہیں شاید اس میں ذکر کریں یا نہ کریں۔

بات تو یہ ہے یہ اسلامی کانفرنس ہی تھی جس کے بعد یاسر عرفات نے اقوام متحدہ میں خطاب کیا اور تنظیم آزادی ء فلسطین کو تسلیم کیا گیا پھر ہم نے یونان اور ترکی کا تنازعہ طے کروانے کی کوشش کی اس طرح کوریا نے بھی شمالی اور جنوبی کوریا کا تنازعہ طے کروانے کے لئے پاکستان کی طرف رجوع کیا۔ ہاتھی نے ان سب باتوں کر پسند نہیں کیا کہ پاکستان کو یہ مقام حاصل ہو۔آج اپوزیشن نے اپنی انتخابی مہم پر ہر بات کا ذکر کیا اور گالیاں تک دیں مگر ایک نہایت اہم بات چھوڑ دی۔ اس پر کچھ نہ بولے اور یہ بات پاکستان اور فرانس کے درمیان ایٹمی پلانٹ کی خریداری کے معاہدے کی تھی جبکہ اس اپوزیشن کو معلوم تھا کہ اس مسئلہ پر عالمی دباؤ ہے۔ ہر سوال پوچھا گیا لیکن یہ نہیں پوچھا گیا کہ اس معاہدے پر کیا کیا جانے والا ہے؟ انہیں، مجھ سے یہ پوچھنا چاہئے تھا کہ آپ اس معاہدے کو ختم کریں گے یا اسے مکمل کریں گے؟ میں نے یہ معاہدہ آخر اپنے ذاتی مفاد کیلئے تو نہیں کیا تھا۔

یہ لوگ میرے خون کے پیاسے کیوں ہیں؟ یہ شکاری کتے میرے خون کے پیاسے کیوں ہیں؟ صرف اس لئے کہ میں نے اس مسئلہ پر قومی موقف اختیار کیا ہے اس طرح وہ تیسری دنیا کی کانفرنس سے بھی پریشان ہیں کہ اس شخص (بھٹو) نے آزادانہ فیصلے کیے ہیں اور یہ ہمارے لئے مصیبت کا سبب بن گیا ہے۔ جب کہ میری حکومت کی یہ پالیسی نہیں کہ ہم ایٹم بم بنائیں لیکن سوال یہ ہے کہ ہمیں ایٹمی ٹیکنالوجی میں آگے بڑھنے سے کیوں روکا جائے اگر جنگ کے لئے نہیں بلکہ امن مقاصد کے لئے تمام ضمانتیں دیتے ہوئے ایٹمی ٹیکنالوجی میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس سے روکنے کا کیا جواز ہے؟ وہ ہمیں صرف اس لئے روک رہے ہیں کہ پاکستان کو ایٹمی توانائی بنانے کی صلاحیت حاصل نہیں ہونی چاہئے۔ جب ہنری کسنجر آئے تو انہوں نے ایٹمی پلانٹ پر سخت مخالفت پر مبنی مؤقف اختیار کیا۔ پھر وہ فرانس گئے اور وہاں اخبارات میں خاصی ہنگامہ آرائی رہی۔ پھر (امریکہ کی طرف سے) مجھ سے کہا گیا کہ میں اس پر مذاکرات کروں۔ میں نے کہا کہ انتخابات ہو جانے دیں۔ اس کے بعد پھر مذاکرات پر زور دیا گیا تو میں نے کہا کہ اب میرا انتخاب ہو رہا ہے۔"

www.bhutto.org

یہ ہیں وہ باتیں کہ بھٹو نے پلانٹ پر مذاکرات نہ کیے تو امریکیوں نے پی این اے کے ذریعے ان کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کروا دیا جس میں نظام مصطفیٰ اور انتخابی دھاندلی کا ڈھونگ رچایا گیا۔ شہید بھٹو نے اسی بنیاد پر اپنی اس تقریر میں آگے چل کر کہا۔

''ایٹمی پلانٹ کے بارے میں میرے قوم پرست موقف کی وجہ سے ''بلڈ ہاؤنڈ'' میرے خون کے پیاسے ہیں۔ عوام کو اصل کہانی سے ضرور واقف ہونا چاہئے۔ میں کل تک خاموش رہا ہوں۔ اب عوام کو اصل کہانی کا ضرور پتہ ہونا چاہئے کیونکہ یہ بہت بڑی سازش ہے' میں نے اب تک صبر و تحمل سے کام لیا ہے۔ یہ کوئی دیسی سازش نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی سازش ہے لیکن میں نے ماضی میں بھی سازشوں کا مقابلہ کیا ہے اور اس کا بھی کروں گا میں اقتدار سے چمٹا نہیں رہنا چاہتا لیکن میں اپنا مشن مکمل کر کے رہوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ صلاحیت دی ہے کہ میں ملک کی خدمت کروں۔ میں نے عورتوں، مزدوروں اور کسانوں کو آزادی دلائی اور اجارہ داری ختم کی۔ اس طرح میرے مشن کا پہلا حصہ تو مکمل ہو گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ افغانستان کے ساتھ باعزت اور باوقار سمجھوتا ہو جائے۔ اس معاملے کو کافی حد تک آگ بڑھایا جا چکا ہے۔ صدر داؤد سے گزشتہ جون کے مذاکرات میں بڑی حد تک اجمالی مفاہمت ہو چکی ہے۔

علاوہ ازیں میں مسلح افواج کی صلاحیت کو بھی مزید بڑھانا چاہتا ہوں اور اس کام کے لیے میں 1963ء سے کوشاں ہوں۔ تیسرے یہ کہ مسئلہ کشمیر کو ہم باوقار اور باعزت طور پر حل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ تاہم اس میں کچھ وقت لگ سکتا ہے۔ اس طرح میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پہلے میں اپنے دو کام مکمل کر لوں گا اور تیسرے کو مکمل کرنے کی بھی پوری توقع رکھتا ہوں اور پھر ضروری تو نہیں کہ آدمی اپنے تمام مشن مکمل کرے۔ ماؤزے تنگ بھی اپنے تمام مشن مکمل نہیں کر سکے۔

اب یہ بات وضاحت طلب نہیں رہ گئی کہ وہ تین کام کیا تھے جو شہید بھٹو کے سامنے تھے۔ افغانستان کے ساتھ سرحدی تنازعے کا حل، مسئلہ کشمیر کا حل، جس کی بنیاد انہوں نے عوام کے حق خود ارادی کو قرار دیا تھا اور پاکستان کی ایٹمی صلاحیت جس کی بنیاد انہوں نے رکھی تھی اور حیرت انگیز طور پر جانتے تھے کہ یہ اُن کی زندگی کے بعد پورا ہو گا۔

نفاذ شریعت کے نام مذہبی جنون پھیلانے والوں کو بے نقاب کرتے ہوئے اس

www.bhutto.org

تقریر میں شہید بھٹو نے کہا:

"نفاذ شریعت کا مطالبہ کرنے والے اب اس مسئلہ کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ نظام مصطفیٰ کے نام پر اپوزیشن نے ملک میں جنون پھیلا دیا تھا لیکن اب مولانا مودودی جیسی شخصیت کہہ رہی ہے کہ یہ اصل مسئلہ نہیں ہے۔"

اس مذہبی جنون کے پیچھے، اس امریکی حکمران طبقے کا ہاتھ تھا جسے شہید بھٹو نے ہاتھی کا نام دیا تھا کیونکہ ہاتھی اس وقت امریکہ میں حکمران پارٹی کا انتخابی نشان بھی تھا۔ نظام مصطفیٰ کے نام پر پاکستان میں مذہبی جنون اور فرقہ واریت پھیلانے والوں کے آقا ضیاء الحق نے پردے کے پیچھے بیٹھ کر اس سارے جنون کی نگرانی کی اور خود بھی امریکی کمان کے تحت کام کیا۔ بعد اسی جنرل ضیاء نے سیاسی جماعتوں کو سیاست سے نکال دیا اور بلدیاتی انتخابات بھی ذات برادری اور مذہبی جنون کے نام پر منعقد کیے۔ پاکستان میں مذہبی جنون اور ذات پات کو استعمال کرنے کے جس منصوبے پر سرمایہ دار بلاک کے ایجنٹوں نے بے رحمی سے عمل کر کے وہ مثال دہرا دی، جس طرح بادشاہ اکبر کی مذہبی رواداری کی پالیسی راسخ العقیدہ امراء نے زبردست تنقید کا نشانہ بنایا اور اسلام خطرے میں ہے کا نعرہ لگا کر اقتدار میں اپنے حصے کو یقینی بنایا۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ پاکستان میں روس نوازی کا نعرہ لگانے والے جو گروپ اور پارٹیاں موجود تھیں ان کے لیڈروں کی زیادہ تعداد بھی امریکی پشت پناہی پر چلنے والی پی این اے کی فاشٹ تحریک کے ساتھ مل گئی۔ انہوں نے اپنی غلطی سے پاکستان میں بائیں بازو کی تحریک کو بھی تباہ کر ڈالا اور شہید بھٹو کی پاپولسٹ انداز میں بڑھنے اور پھولنے والی انقلابی تحریک کو کچل ڈالا اور بھٹو کو پھانسی لگوانے کے لیے ولی خان جیسے سیکولرازم اور قوم پرستی کا دعویٰ کرنے والے لیڈر نے بھٹو حکومت کے خاتمے کے بعد" پہلے احتساب پھر انتخابات" کا نعرہ لگا دیا بہر حال بھٹو شہید ہو کر امر ہو گئے لیکن جعلی سوشلسٹ اور اسلام پسند بے نقاب ہو گئے۔ قومی اسمبلی کے 28 اپریل 1977ء کے اس اجلاس کے آگے پیچھے ایک طرف تو امریکی منصوبے کے ترجمان اخبارات، پی این اے کی تعریفیں اور بھٹو کی مخالفت کرتے رہے لیکن دوسری طرف ان کی حکومت کو ختم کروانے اور پھانسی کے تختے تک

www.bhutto.org

پہنچانے والے امریکہ کا صدر جمی کارٹر، 29 نومبر 1976ء کو شہید بھٹو کے نام اپنے خط میں انہیں لکھ رہا تھا کہ:

''میں دونوں ممالک کے مابین دوستی کے روابط کو مستحکم کرنے کے لیے آپ کے ساتھ مل کر کام کرنے کا متمنی ہوں۔ براہ کرم میری طرف سے داد قبول کیجیے اور حد درجہ آداب قبول کیجیے۔''

لیکن اس کے ساتھ ہی امریکی میڈیا این بی سی کے نشریاتی مبصر ڈیوڈ برکلے نے کہہ دیا تھا کہ ''وزیراعظم بھٹو تو چینی کمیونسٹ پارٹی کے چیئرمین ماؤزے تنگ کے پیارے لیڈر ہیں۔''

لیبیا کے صدر کرنل قذافی نے اگرچہ 25 فروری 1974ء کو ہی تیسری دنیا کے لوگوں سے یہ کہہ دیا تھا کہ بھٹو کے پیچھے صف باندھ کر کھڑے ہو جاؤ لیکن 1976ء سے 1977ء تک قذافی اور یاسر عرفات کو بھی امریکی سازشوں کا سامنا تھا اور پاکستان کے ایٹمی پلانٹ میں مدد دینے والے سعودی عرب کے شاہ فیصل کو بالآخر شہید کر دیا گیا تھا۔ اس توقع پر عوامی جمہوریہ (شمالی) کوریا کو صدر کم ال سنگ نے 21 مئی 1977ء کو اپنے سرکاری بیان میں کہا تھا کہ ''پاکستان کے ممتاز رہنما وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو غیر ملکی مداخلت کو ناکام بنانے اور اندرون ملک غیر ملکی طاقتوں کے ایماء پر کام کرنے والے رجعت پسندوں کی رشیہ دوانیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جو کوششیں کر رہے ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا مقصود پاکستان کے عوام کی اُمنگوں کے مطابق ملک کی سلامتی کا تحفظ ہے۔'' اس کے علاوہ عراق اور شام کے سربراہوں اور یاسر عرفات سے لے کر چین کی حکومت تک سب شہید بھٹو کی حمایت کر رہے تھے لیکن ان سب کی حمایت پاکستان کے اندر اس وقت مؤثر کیسے ہو سکتی تھی جب پیپلز پارٹی کے اندر گھسے ہوئے موقع پرستوں اور سازشیوں نے پارٹی کو اس قابل بننے ہی نہیں دیا تھا۔ اور جنرل ضیاء الحق کو یہ موقع مل گیا تھا کہ وہ اپنی غلیظ فاشٹ سازش میں کامیاب ہو جائیں اور یہی ہوا۔

شہید بھٹو کو پھانسی نہ دینے کی اپیل کرتے ہوئے پوری دنیا کے سربراہوں نے جنرل ضیاء کو خط لکھے مگر جنرل ضیاء کے اصل سرپرست اسرائیل اور امریکہ یہ چاہتے تھے کہ بھٹو کی جان باقی نہ رہے۔ اس لیے جنرل ضیاء الحق اپنی قاتلانہ روش سے باز نہ آیا۔ طویل

www.bhutto.org

عدالتی بیان میں نظر آتا ہے جو انہوں نے اپنی جسمانی زندگی کے آخری مہینوں میں سپریم کورٹ میں دیا۔ اپنے اس بیان میں شہید بھٹو کہتے ہیں۔

"میں نے اپنی 4 دسمبر والی درخواست میں یہ استدعا کی تھی کہ میں اس معزز عدالت کے سامنے پیش ہونا چاہتا ہوں کیونکہ میرے نقطہ نظر کے مطابق میری زندگی تو ایک انفرادی زندگی کی حیثیت میں اس مقدمے میں ملوث ہے جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ معروضی حالات بھی داؤ پر لگے ہوئے ہیں۔ میری شہرت، میرے خاندان کا وقار، میرا سیاسی مستقبل اور ان سب سے بڑھ کر پاکستان کا مستقبل بھی اس مقدمے میں ملوث ہے۔"

بھٹو شہید کے ان ابتدائی جملوں سے ہی یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اس مقدمے میں پاکستان کا مستقبل کیسے ملوث تھا؟ بعض نا اہل اور متعصب افراد یہ کہتے ہیں کہ بھٹو کے شہید ہونے سے پاکستان کے ٹکڑے تو نہیں ہو گئے۔ اس لیے ان کے اس جملے کو اہمیت کیوں دی جائے؟ سوال یہ ہے کہ کیا کسی ملک کے تباہ ہونے کا مطلب صرف اس کا جغرافیائی طور پر ٹکڑے ہونا ہوتا ہے؟ نہیں بلکہ کسی ملک کا محض جغرافیائی طور پر قائم رہنا لیکن اقتصادی طور پر برباد ہو جانا بھی اس ملک کی تباہی کہلاتا ہے۔ لیکن اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ پاکستان اقتصادی طور پر برباد نہیں ہوا بلکہ ترقی یافتہ ملک بن گیا ہے تو اس حقیقت کی کوئی تردید ہو سکتی ہے کہ پاکستانی معاشرے میں جو نراجیت، قتل و غارت، بے عزتی اور بے آبروئی اور فسادات جیسے عوامل دس سال کے مارشل لاء میں ابھر کر سامنے آئے تھے انہوں نے پاکستانی معاشرے کو ایک قیامت خیز معاشرہ بنا دیا ہے۔ اگر ترقی اس بات کا نام ہے کسی ملک میں جدید کمپیوٹر اور جدید فیشن انتہا پر پہنچے ہوئے ہوں لیکن یہ سب کچھ انسان کی فنکارانہ صلاحیتوں کی بجائے تصنع اور سودے بازی کی بنیاد پر چل رہا ہو تو یہ ایک کہنا ایک حقیقت ہو گا کہ پاکستان کا مستقبل ان دس سالوں کے دوران برباد کر دیا گیا ہے اور اگر اس کو بچانے کے لیے کوئی راستہ نکالا ہے تو وہ شہید بھٹو کی بیٹی اور اس کے ساتھیوں نے صرف اور صرف جمہوری جدوجہد میں بے مثال قربانیاں دے کر نکالا۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ ڈی پولیٹیکلائزیشن کے ذریعے چیچہ ذہنیت رکھنے والے کرداروں کو سیاستدانوں کا نام دے دیا گیا اور ان کو مجلس شوریٰ سے لے کر اسمبلیوں تک

www.bhutto.org

محض ذاتی مفاد استحصال اور رشوت و سفارش کا دھندا چلانے کے لیے بٹھایا گیا۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ذات پات، کمرشل ازم اور مذہبی جنونیت کی آڑ میں ہیروئن اور کلاشنکوف کلچر کو رائج کیا گیا اور ظالم و مظلوم کی جنگ میں مظلوموں کو جو راستہ بھٹو شہید نے دکھایا اس کو روک کر لسانی اور فرقہ وارانہ فسادات کو رائج کر دیا گیا۔ یہ حقیقت نہیں کہ مسئلہ افغانستان میں سوویت سربراہ ژنیف کی غلطی کی مخالفت کا بہانہ بنا کر امریکی حکومت کی غلط کاریوں کی غلامی کر کے پوری قوم کو جنگ میں جھونک دیا گیا۔ مسئلہ افغانستان کے نام پر کروڑوں روپے کی منشیات اور اسلحہ فروشی کے دھندے چلائے گئے اور ملک کی تمام اندرونی اور بیرونی آمدنی کو صنعتکاری میں لگانے کے بجائے مرکنٹائل ازم کے پھیر میں ڈال دیا گیا۔ جس کے فائدے صرف زر پرست طبقوں، مذہبی جنونیوں اور بدعنوان افسروں کو پہنچے اور ملک کے عوام ایک سطحی فکل پالیسی کے جھنجھٹ میں الجھ کر رہ گئے۔

اگر یہ دیکھا جائے کہ بھٹو جیسی ایک شخصیت اور ان کے خاندان کو کیوں عذاب میں ڈالا گیا تو حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ تاریخ کے ارتقائی سفر میں ترقی پسند تحریکوں نے جو بھی تخلیقی اور مثبت کردار ادا کیا ہے اس میں ایک فرد کا کردار لاکھوں کروڑوں عوام کے کردار سے جدا نہیں ہوتا اور وہ فرد ذوالفقار علی بھٹو جیسی شخصیت ہو تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ شخصیت مظلوم طبقوں کا کوئی انقلاب خواہ نہ لا سکے، لیکن اس انقلاب کے سرچشموں کو متحرک اور فعال ضرور بنا کے جاتی ہے۔ یہی وہ کام تھا جو شہید بھٹو نے کیا اور اسی کام کی وجہ سے ان کو سزائے موت سنائی گئی تاکہ ان سرچشموں سے پھوٹنے والے انقلاب کا راستہ روکا جائے یا اس کے آنے میں تاخیر کی جائے۔ اپنے عدالتی بیان میں شہید بھٹو نے جو کہا ہے کہ معروضی حالات بھی اس مقدمے میں داؤ پر لگے ہوئے ہیں تو اس بات کا مطلب ان کی تقریروں میں خاص طور پر سمجھ آ جاتا ہے جن میں سے ایک انہوں نے اگست 1976ء میں ہنری کسنجر کے سامنے لاہور میں کی تھی اور دوسری اپریل 1977ء میں قومی اسمبلی میں۔ یہ دونوں تقریریں پچھلے صفحات میں پیش کی جا چکی ہیں۔

3 نومبر 1976ء کو جمی کارٹر امریکہ کے صدر منتخب ہوئے۔ بھٹو صاحب اس بات سے باخبر تھے کہ امریکہ ان پر وار کرے گا۔ وقت و حالات کے پیش نظر بھٹو شہید نے 1978ء میں انتخابات کرانے کی بجائے مارچ 1977ء کو انتخابات کرانے کو ترجیح دی اور

www.bhutto.org

علان کر دیا۔

ذوالفقار علی بھٹو لاڑکانہ سے بلا مقابلہ منتخب ہوئے اور ان کی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی واضح اکثریت سے کامیاب ہوئی لیکن قومی اتحاد (پی این اے) نے انتخابات کے نتائج یکسر مسترد کر دیئے۔ پاکستان میں احتجاجی تحریک شروع ہوئی اور امریکی سی آئی اے بنگلہ دیش کے عوام میں یہ غلط فہمی پھیلا رہا تھا کہ ''شیخ مجیب الرحمٰن'' بھٹو صاحب نے کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری جنرل عبدالحق کی خواہش کے مطابق مجیب الرحمٰن کے قتل کے لیے رقم اور اسلحہ فراہم کیا ہے۔ اس پہلو سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکی سازش تھی کہ کسی طرح سے بھٹو کی بین الاقوامی سطح پر ساکھ برباد کر دی جائے۔

4 اور 5 جولائی 1977ء کی درمیانی شب سے چند گھنٹے قبل بھٹو شہید سے ضیاء الحق نے اپنی وفاداری کا عہد کیا اور فقط چند گھنٹے کے بعد عہد شکنی کرتے ہوئے ''مردمومن'' نے ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ 5 جولائی 1977ء کو قومی و صوبائی اسمبلیاں توڑ دی گئیں اور آئین معطل کر دیا گیا۔ ''مردمومن ضیاء الحق'' نے اس طرح اپنی وفاداری اور عہد نبھایا۔ 27 جولائی ضیاء الحق نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''دنیا دیکھ لے گی کہ اکتوبر 1977ء میں انتخابات کروا کر اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔'' ضیاء الحق نے قوم سے کیے گئے وعدے کو اپنی آخری سانس تک ایفاء نہ کیا۔ ایک سوچی سمجھی چال کے ساتھ 24 اگست کو قومی اتحاد اور پیپلز پارٹی کو انتخابی نشانات آلاٹ کر دیے۔ یہ وہ چال یا منصوبہ تھا کہ جس کے تحت ''مردمومن ضیاء الحق'' نے بین الاقوامی سطح پر جھوٹا تاثر دیا کہ اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو دیا جائے گا۔ اب یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ ضیاء الحق اول سے الیکشن نہ کروانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ بین الاقوامی شخصیت و ہر وقت تلاوت کرنے والی شخصیت نے صرف پاکستانی قوم کے ساتھ نہیں بلکہ بین الاقوامی جھوٹ بولا تھا۔

ضیاء الحق نے جنرل فیض علی چشتی کے ذریعے بھٹو مخالفین کو کہا کہ اگر انتخابات کروائے گئے تو ذوالفقار علی بھٹو اور ان کی جماعت پیپلز پارٹی واضح اکثریت سے جیت جائے گی لہٰذا ''بھٹو صاحب'' کی گرفتاری ضروری قرار دی جائے۔ اب ضیاء کی خواہش کے عین مطابق اپوزیشن نے انتخابات کی بجائے بھٹو کو قتل کروانے کی حمایت کر دی۔

www.bhutto.org

3 ستمبر 1977ء کو نواب محمد احمد خان کے قتل کے الزام میں 70 کلفٹن سے ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کر لیا گیا۔ 29 ستمبر 1977ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو نے اوکاڑہ میں جلسہ عام سے خطاب کیا اور آمریت کے عزائم کا پردہ چاک کیا تو اس کی پاداش میں محترمہ بینظیر بھٹو کو نظر بند کرنے کے احکامات صادر کیے گئے۔ اور ساتھ ہی یکم اکتوبر 1977ء کو انتخابات ملتوی کر دیے گئے۔

9 اکتوبر 1977ء کو شہید بھٹو کی جج مولوی مشتاق حسین نے ضمانت منسوخ کر دی اور مولوی مشتاق حسین نے ہی بعد میں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کی سزا سنائی۔ 16 مارچ 1978ء کو محترمہ بینظیر بھٹو نے ایک بیان میں کہا کہ ہائی کورٹ ان کے والد ''بھٹو'' کو پھانسی کی سزا سنانے والی ہے اور ٹھیک دو روز بعد 18 مارچ 1978ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو سزائے موت سنا دی گئی۔ 25 اکتوبر 1978ء کو سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی گئی۔ 18 مئی 1978ء کو بھٹو کو بذریعہ ہیلی کاپٹر لاہور جیل لکھپت سے راولپنڈی منتقل کر دیا گیا۔

اب کیا تھا؟ صرف قومی اتحاد اور ضیاء۔ 16 ستمبر 1978ء کو فضل الٰہی چوہدری کو صدارت سے فارغ کر دیا گیا اور ضیاء مسندِ صدارت پر براجمان ہو گیا۔

6 فروری 1979ء کو سپریم کورٹ نے ہائی کورٹ کا فیصلہ جس میں بھٹو کو پھانسی کا حکم نامہ درج تھا برقرار رکھا۔ راولپنڈی سنٹرل جیل جہاں ذوالفقار علی بھٹو مقید تھے اُس سے چند کلومیٹر کے فاصلہ پر سہالہ پولیس ٹریننگ کیمپ میں محترمہ بینظیر بھٹو اور ان کی والدہ بیگم نصرت بھٹو قید میں تھیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو جلاوطن تھے۔

''3 اپریل 1979ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو کی ذوالفقار علی بھٹو سے آخری ملاقات کروائی گئی۔ محترمہ بینظیر بھٹو کے الفاظ ہیں کہ

''3 اپریل 1979ء کو ایک تیز رفتار جیپ میں ہمیں سہالہ سے راولپنڈی جیل پہنچا دیا گیا۔ جیل کی میٹرن نے میری والدہ اور میری تلاشی لی ایک مرتبہ جب ہم سہالہ کے قید خانہ سے روانہ ہوئیں اور دوسری مرتبہ جب ہم راولپنڈی جیل پہنچیں۔ آج تم دونوں اکٹھی کیوں آئی ہو؟ میرے والد نے کالی کوٹھڑی کی دوزخ سے آواز دی۔

میری والدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

کیا یہ آخری ملاقات ہے؟ انہوں نے پوچھا۔

www.bhutto.org

اس وقت میری والدہ جواب دینے کی سکت نہ رکھتیں تھیں۔

''میرا خیال ہے ایسا ہی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ جیل سپرنٹنڈنٹ کو اشارہ کرتے ہیں جو پاس ہی کھڑا تھا۔

(یہ لوگ ہمیں پاپا کے ساتھ تنہا چھوڑنے پر کبھی تیار نہیں ہوئے)۔

کیا یہ آخری ملاقات ہے؟ میرے والد پوچھتے ہیں۔

''ہاں'' جواب میں جیلر کہتا ہے۔ حکومت کا پیغام دیتے ہوئے۔

شرمسار محسوس ہوتا ہے۔

کیا تاریخ کا تعین ہو گیا ہے؟

''کل صبح'' جیل سپرنٹنڈنٹ کا جواب ہے۔

کتنے بجے؟

جیل قواعد کے مطابق صبح پانچ بجے۔

یہ اطلاع تمہیں کب ملی؟

''کل رات'' اس نے رکتے رکتے جواب دیا۔

میرے والد اسے نظر بھر کے دیکھتے ہیں۔

اپنے اہل وعیال سے ملاقات کا کتنا وقت دیا گیا ہے۔

نصف گھنٹہ۔

''جیل قواعد کے مطابق ہمیں ایک گھنٹہ ملاقات کا حق ہے'' وہ کہتے ہیں۔

''صرف نصف گھنٹہ'' سپرنٹنڈنٹ دہراتا ہے۔ ''یہ میرے احکامات ہیں۔''

''غسل اور شیو کرنے کے لیے انتظامات کرو'' میرے والد اسے کہتے ہیں۔ ''دنیا خوبصورت ہے اسے میں اسی حالت میں الوداع کہنا چاہتا ہوں۔''

''صرف نصف گھنٹہ'' اس شخص سے ملاقات کے لیے۔۔۔۔ صرف نصف گھنٹہ جو مجھے زندگی کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے سینے میں درد سے گھٹن محسوس ہوتی ہے مجھے رونا نہیں چاہیے مجھے اپنے ہوش بھی نہیں کھونے چاہییں کیونکہ اس طرح میرے والد کی اذیت بڑھ جائے گی۔

وہ فرش پر پڑے گدے پر بیٹھے ہوئے ہیں ان کی کوٹھڑی میں اب صرف یہی

www.bhutto.org

فرنیچر باقی رہ گیا ہے جیل حکام کرسی اور میز لے جا چکے ہیں چارپائی بھی وہاں سے اُٹھائی جا چکی ہے۔ میگزین اور کتابیں جو میں پاپا کے لیے لاتی رہی تھی وہ میرے حوالے کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''انہیں لے جاؤ میں نہیں چاہتا یہ لوگ میری کسی چیز کو ہاتھ لگائیں۔''

وہ چند سگار جوان کے وکلاء وہاں چھوڑ گئے تھے۔۔۔ میں آج شب کے لیے صرف ایک رکھ لیتا ہوں۔ شالیمار کولون کی شیشی بھی رکھ لیتے ہیں۔ وہ اپنی انگوٹھی بھی مجھے دینا چاہتے ہیں۔ لیکن میری والدہ انہیں کہتی ہیں ''اسے پہنے رکھیں'' وہ کہتے ہیں ''اچھا ابھی میں رکھ لیتا ہوں لیکن بعد میں بے نظیر کے حوالے کر دی جائے۔''

''میں نے ایک پیغام باہر کی دنیا تک پہنچا دیا ہے'' میں نے بہت آہستہ آہستہ انہیں بتایا (جیل کے حکام میری آواز سننے کی کوشش کرتے ہیں)۔

میں تفصیلات بتاتی ہوں وہ اطمینان محسوس کرتے ہیں ''یہ سیاست کے اسرار و رموز میں ماہر ہو چکی ہے'' ان کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہوتا ہے۔ موت کی کوٹھڑی میں روشنی مدھم سی ہے میں انہیں صاف طور پر نہیں دیکھ سکتی۔ اس سے قبل ہر ملاقات کوٹھڑی میں ان کے پاس بیٹھ کر ہوتی رہی لیکن آج ایسا نہیں ہے۔ کوٹھڑی کے باہر دروازے کی سلاخوں کے ساتھ میں اور میری والدہ سکڑ کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ باتیں کھسر پھسر کے انداز میں کرتے ہیں۔ ''دوسرے بچوں کو میرا پیار دینا'' وہ میری ممی سے کہتے ہیں۔ ''میر، سنی اور شاہ کو بتانا میں نے ہمیشہ ایک اچھا باپ بننے کی کوشش کی ہے اور میری خواہش ہے کہ کاش انہیں بھی الوداع کہہ سکتا۔'' میری والدہ سر ہلاتی ہیں منہ سے کچھ نہیں بول سکتیں۔

''تم دونوں نے بہت تکالیف اُٹھائی ہیں'' وہ کہتے ہیں'' وہ آج مجھے قتل کرنے جا رہے ہیں۔ میں تمہیں تمہاری مرضی پر چھوڑتا ہوں اگر چاہو تو پاکستان سے اس وقت تک باہر چلے جاؤ جب تک آئین معطل ہے۔ اور مارشل لاء نافذ ہے اگر تمہیں ذہنی سکون چاہیے اور زندگی نئے سرے سے گزارنا چاہتی ہو تو یورپ چلی جاؤ میری طرف سے اجازت ہے۔''

(ہمارے دل ٹوٹ رہے ہیں) ''نہیں، نہیں'' ممی کہتی ہیں۔ ''ہم نہیں جا سکتے'' ہم کبھی نہیں جائیں گے۔ جرنیلوں کو کبھی یہ تاثر نہیں دیں گے کہ وہ جیت چکے ہیں۔ ضیاء

www.bhutto.org

نے انتخابات کا دوبارہ پروگرام بنایا ہے اگرچہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ ایسا کرنے کی جرأت بھی کرے گا یا نہیں۔۔۔۔۔ہم باہر چلی جائیں تو پارٹی کی رہنمائی کے لیے کوئی نہیں ہوگا اور یہ وہ پارٹی ہے جس کی آپ نے بنیاد رکھی اور پروان چڑھایا۔

''اور تم پنکی!'' میرے والد پوچھتے ہیں۔

''میں کبھی نہیں جا سکتی۔'' میرا جواب ہے۔

وہ مسکراتے ہیں۔'' میں بہت خوش ہوں۔۔۔۔تم نہیں جانتی مجھے تم سے کتنا پیار ہے۔''

''تم میری لعل ہو اور ہمیشہ ہی رہی ہو۔''

''وقت ختم ہو چکا'' سپرنٹنڈنٹ پکارتا ہے۔''وقت ختم ہو چکا''۔

میں سلاخوں کو پکڑ لیتی ہوں۔

''برائے مہربانی کوٹھڑی کا دروازہ کھول دو میں اسے کہتی ہوں میں اپنے پاپا کو الوداع کہنا چاہتی ہوں۔''

سپرنٹنڈنٹ انکار کر دیتا ہے۔

میں دوبارہ التجا کرتی ہوں'' میرے والد پاکستان کے منتخب وزیر اعظم ہیں۔ میں ان کی بیٹی ہوں یہ ہماری آخری ملاقات ہے مجھے ان سے مل لینے دو۔''

سپرنٹنڈنٹ انکار کر دیتا ہے۔

سلاخوں کے درمیان سے میں اپنے والد کے جسم کو چھونے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ اس قدر نحیف و ناتواں ہو چکے ہیں۔ ملیریا، پیچش اور ناکافی خوراک کھانے کی وجوہ سے جسم بالکل نحیف اور باریک ہو چکا ہے۔ لیکن وہ سیدھا اٹھ بیٹھتے ہیں۔ اور میرے ہاتھ کو چھو لیتے ہیں۔

'' آج شب ملائم دنیا سے آزاد ہو جاؤں گا'' چہرے پر ایک چمکتی روشنی لیے کہتے ہیں۔''میں اپنی والدہ اور اپنے والد کے پاس چلا جاؤں گا۔'' میں لاڑکانہ میں اپنے اجداد کی زمینوں کی طرف واپس جا رہا ہوں تاکہ اس سرزمین کا، اس کی خوشبو اور اس کی فضا کا حصہ بن جاؤں۔''

''خلق خدا میرے بارے میں گیت گائے گی میں اس کی کہانیوں کا جاوداں حصہ

www.bhutto.org

بن جاؤں گا۔"

وہ مسکراتے ہوئے کہتے ہیں۔ "لیکن لاڑکانہ میں آج کل بہت گرمی ہے۔"

"میں وہاں ایک سائبان تعمیر کر دوں گی" میں بمشکل کہہ سکی۔ جیل حکام آگے بڑھتے ہیں۔

"الوداع پاپا!" میں والد کی طرف دیکھ کر پکار اُٹھتی ہوں اور میری ممی سلاخوں میں سے ان کو چھو لیتی ہیں۔ ہم گرد آلود صحن سے گزرتے ہیں۔ میں مڑ کر پیچھے دیکھنا چاہتی ہوں لیکن حوصلہ نہیں پڑتا۔ مجھے معلوم ہے میں ضبط نہیں کر سکوں گی۔ "ہم جب پھر ملیں گے اس وقت تک خدا حافظ" مجھے ان کی آواز سنائی دیتی ہے۔

تاہم میں چل پڑتی ہوں۔ مجھے چلنے کا مطلق احساس نہیں ہو رہا۔ میں پتھر بن چکی ہوں۔ جیل حکام ہمیں جیل وارڈ کے اندر واپس لے جاتے ہیں۔ صحن میں فوجیوں کے متعدد ٹینٹ ایستادہ ہیں میں مدہوشی کے عالم میں چلی جا رہی ہوں صرف اپنے سر کی موجودگی کا احساس ہے۔ سر بلند رہنا چاہیے وہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہیں۔"

مقفل دروازوں کے اندر کار ہماری منتظر ہے تاکہ باہر ہجوم ہمیں دیکھ نہ سکے۔ میرا جسم اس قدر بوجھل ہو گیا ہے کہ کار کے اندر داخل ہونا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ کار دروازوں کے بیچ میں سے تیزی سے حرکت کرتی ہے۔ اسے دیکھتے ہی ہجوم کے ایک سرے پر کھڑی اپنی دوست یاسمین پر اچانک میری نظر پڑتی ہے۔ جس کے ہاتھ میں والد کے دینے کے لیے خوراک کا ٹفن کیریئر ہے۔ "یاسمین! وہ آج رات انہیں مار دیں گے" میں کار کے شیشوں میں سے چلائی۔ "کیا اس نے میری آواز سنی؟"۔ "کیا میں نے کوئی آواز نکالی بھی یا نہیں۔۔۔۔۔ کیا کہہ سکتی ہوں؟"

صبح کے پانچ بج گئے پھر چھ بجے۔۔۔۔ ہر سانس جو میں لیتی مجھے اپنے والد کی آخری سانسوں کی یاد دلاتا۔ "اے خدا! کوئی معجزہ رونما ہو جائے" میری ماں اور میں نے دعا مانگی۔ "کچھ نہ کچھ ہو جانا چاہیے"۔ میری چن چن جسے میں نے اپنے ساتھ قید خانے میں لے آئی تھی وہ بھی تناؤ کو محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اپنے بلونگڑوں کو کہیں چھپا دیا تھا وہ کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

www.bhutto.org

ہم ناقابل یقین امید کے ساتھ چپکے ہوئے تھیں۔ سپریم کورٹ نے متفقہ طور پر سفارش کی تھی کہ میرے والد کی سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا جائے مزید براں پھانسی دیئے جانے کی صورت میں پاکستانی قانون کے مطابق ایک ہفتہ قبل دن اور تاریخ کا تعین اعلانیہ کر دیا جائے۔ لیکن ایسا کوئی اعلان سرے سے کیا ہی نہیں گیا۔

پی پی پی کے راہنماؤں نے بھی یہ پیغام ارسال کیا کہ ضیاء نے سعودی عرب، متحدہ امارات اور دوسرے ملکوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ میرے والد کی سزائے موت کو تبدیل کر دے گا۔ لیکن ضیاء کا ریکارڈ قانون سے بے اعتنائی اور جھوٹے مواعید سے بھرا پڑا تھا۔ ہمارے مستقل خدشات کی بدولت، جب بھی پھانسی کی حتمی تاریخ کا حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا۔ سعودی عرب کے وزیر خارجہ اور لیبیا کے وزیر اعظم نے فوراً بذریعہ طیارہ پاکستان پہنچنے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔" کیا انہوں نے بی بی سی پر میرا پیغام سن لیا تھا؟ کیا ابھی بھی ان کے پاس پاکستان پہنچنے کا وقت تھا؟"۔

چینیوں کا ایک وفد اسلام آباد میں تھا۔ میرے والد ہی نے پاکستان چین دوستی کا آغاز کیا تھا۔ کیا وہ ضیاء کو اپنے فیصلے سے منحرف کرا سکیں گے؟

میری والدہ اور میں سہالہ کی شدید گرمی میں بے حس و حرکت اور خاموش بیٹھی تھیں۔ ضیاء نے یہ بات بھی پھیلائی تھی کہ وہ رحم کی اپیل اس وقت ہی سنے گا اگر یہ میرے والد یا ہماری طرف سے کی گئی۔ میرے والد نے ایسا کرنے کو سختی سے منع کر دیا تھا۔

موت کی جانب گنتی کے یہ لمحات کیسے گزرتے ہیں؟ میری والدہ اور میں گم سم بیٹھی تھیں۔ بعض اوقات ہم چلاتی بھی تھیں۔ جب ہم میں بیٹھنے کی سکت باقی نہ رہی تو ہم بستر کے تکیوں پر گر گئیں۔ وہ ان کی زندگی ختم کر دیں گے، میں متواتر سوچتی رہی۔ وہ ان کی زندگی ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کے اپنے احساسات اس بھرپور تنہائی میں کیسے ہوں گے۔ جب کہ ان کے پاس اس وقت کوئی بھی نہیں؟ انہوں نے اپنے پاس کوئی کتاب بھی نہیں رکھی۔ انہوں نے اپنے پاس کچھ بھی نہیں رکھا صرف ایک سگار ان کے پاس تھا۔ میرا گلا گھٹن سے جڑ گیا اور میں اسے پھاڑ کر کھول دینا چاہتی تھی۔ لیکن میں ان پہرہ داروں کو جو ہماری کھڑکی کے باہر ہر وقت ہنستے اور باتیں کرتے رہتے تھے اپنی چیخوں سے استہزاء

www.bhutto.org

کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ ممی! میں برداشت نہیں کر سکتی بالکل نہیں کر سکتی۔ آخر میں ڈیڑھ بجے کے قریب بالکل ٹوٹ گئی وہ میرے لیے مسکن کی دوائی کی گولیاں لائیں۔ ''سونے کی کوشش کرو'' انہوں نے کہا۔

آدھ گھنٹے کے بعد میں اپنے بستر پر اچانک اُٹھ بیٹھی۔۔۔۔ والد کے گلے میں پھندا میں نے اپنے گلے کے اردگرد محسوس کیا۔

آسمانوں سے اس شب برف کے آنسو برسے۔ لاڑکانہ میں ہماری خاندانی زمینوں پر اولے پڑے۔ گڑھی خدا بخش میں ہمارے آبائی قبرستان میں فوجی دستوں کی ہل چل سے لوگ جاگ اُٹھے۔ جب میری والدہ اور میں اپنے قید خانے میں رات کے وقت کرب کی گھڑیاں گزار رہی تھیں میرے والد کی میت گڑھی میں دفنانے کے لیے بذریعہ طیارہ لے جائی جا رہی تھی۔ مارشل لاء انتظامیہ کی ابتدائی پارٹی نے ہمارے ایک دیہاتی نذر محمد کے ذریعہ تمام انتظامات مکمل کیے تھے۔ نذر محمد اور اس کے خاندان کے افراد ہماری زمینوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اور کئی نسلوں سے ہمارے ساتھ کام کر رہے ہیں۔

نذر محمد کا بیان:

میں ۴ اپریل کی صبح تین بجے اپنے گھر میں سویا ہوا تھا جب میں نے گاؤں کے نواح میں پچاس سے ساٹھ فوجی گاڑیوں کی تیز روشنی دیکھی۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ شاید دو روز قبل کی طرح بھٹو صاحب کو پھانسی دینے کے بعد جو عمل جاری رکھنا ہے اس کی ریہرسل کر رہے ہیں یعنی معمول کی فوجی مشقیں ہیں۔ لوگ بہت خوفزدہ تھے خاص طور پر بھٹو قبرستان میں پولیس کے داخل ہو کر ہر طرف بغور دیکھنے پر جب پولیس نے علی الصبح مجھے گھر سے باہر آنے کو کہا۔ دیہات کے تمام لوگ بوڑھے اور جوان، مرد اور عورتیں اپنے گھروں سے باہر نکل پڑے۔ تمام کو خدشہ تھا کہ بھٹو صاحب کو یا تو پھانسی دی جا چکی ہے یا جلدی دی جانے والی ہے۔ ہر طرف چیخ و پکار تھی اور سب چہروں پر مایوسی۔

''ہمیں بھٹو صاحب کے دفنانے کا انتظام کرنا ہے۔'' لاتعداد فوجی اور پولیس نوجوانوں نے اپنے عارضی ہیڈ کوارٹرز پر مجھے لا کر کہا۔ ''ہمیں وہ جگہ دکھاؤ جہاں قبر کھودیں''۔ میں رو رہا تھا۔ ''ہم تمہیں بھٹو صاحب کو دفنانے کی جگہ کی نشاندہی کیوں کریں؟'' ''ہم ان کی آخری رسومات خود ادا کریں گے۔ بھٹو صاحب ہمارے ہیں میں نے جواب

www.bhutto.org

میں کہا۔'' میں نے انہیں اپنے آدمی قبر کھودنے کے لیے لانے کی اجازت مانگی تاکہ قبر کے لیے کچی اینٹیں اور لکڑی کے تراشے ہوئے پھٹے بھی لائے جاسکیں۔ اور مذہبی رسومات بھی ادا کی جاسکیں۔ انہوں نے مجھے صرف آٹھ آدمیوں سے مدد لینے کی اجازت دی۔

جب ہم اس اذیت ناک کام میں لگے ہوئے تھے فوجی اور پولیس نے پورے گاؤں میں محاصرے میں لے لیا۔ بلکہ چھوٹی سی چھوٹی گلی میں بھی رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ نہ کسی کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت تھی نہ ہی باہر سے گاؤں کے اندر داخل ہونے کی۔ ہم مکمل طور پر باقی دنیا سے کٹ چکے تھے۔ آٹھ بجے صبح دو ہیلی کاپٹر گاؤں سے باہر سڑک پر اترے جہاں ایمبولینس انتظار میں کھڑی تھی میں نے کفن ایمبولینس میں منتقل ہوتے دیکھا اور اس کے پیچھے پیچھے قبرستان تک پہنچا۔'' اس گھر کو خالی کر دو'' فوجی جرنیل نے قبرستان کے جنوبی کونے میں چھوٹی سی رہائش گاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے کہا۔ یہ پیش امام کی رہائش گاہ تھی جو اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ وہاں رہائش پذیر تھا۔ میں نے پیش امام، اس کی بیوی اور اس کے بچوں پر اس ظلم اور ناروا سلوک پر احتجاج کیا مگر کرنیل اپنی بات پر مصر رہا۔

۲۰ مسلح یونیفارم میں ملبوس جوانوں نے اس گھر کی چھت پر مورچہ سنبھال لیا اور اپنی بندوقیں قبرستان کی سمت تان لیں۔ پھر اعلان کیا گیا کہ نزدیکی رشتے دار جانے والے کا آخری دیدار کرلیں۔ بھٹو صاحب کے چچا زاد اور ماموں زاد بھائی قبرستان کے نزدیک گڑھی خدابخش میں رہتے تھے۔ بھٹو صاحب کی پہلی بیوی بھی نزدیکی دیہات نوڈیرو میں رہتی تھیں۔ کافی پس و پیش کے بعد حکام نے مجھے ان کو لانے کی اجازت دی۔ جب وہ پہنچیں تو ہم نے کفن کو کھولا اور میت کو رسی سے بنی ہوئی چارپائی پر منتقل کیا۔ یہ چارپائی میں اپنے گھر سے لے آیا تھا کہ پیش امام کے گھر میں میت کو منتقل کرتے وقت کام آسکے۔ بھٹو صاحب کی بیوی پردہ کرتی تھی اور اپنے گھر والوں کو اجنبی نظروں سے محفوظ رکھنے کے لیے باہر بے پردہ نہیں آنے دیتی تھی۔ خاندان سے باہر کسی مرد کو اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن فوجی جوان تہذیب و تمدن کے تمام معیاروں کو کچلتے ہوئے گھر میں داخل ہو گئے۔

جب میت آدھے گھنٹے بعد گھر سے باہر لائی گئی تو میں نے کرنل سے حلفاً بتانے

www.bhutto.org

کے لیے کہا ''آیا میت کو مذہبی اصولوں اور روائتی رسومات کے مطابق غسل دیا گیا تھا'' کرنل نے حلفاً کہا ایسا ہی کیا گیا تھا۔ میں نے مزید تسلی کے لیے کفن کا کپڑا چیک کیا تو دیکھا کہ جسم پر کفن موجود تھا۔ ہم اس قدر پریشان اور غم زدہ تھے کہ ہمیں باقی جسم کو دیکھنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ مجھے یقین نہیں کہ وہ ہمیں ایسا کرنے کی اجازت دیتے کیونکہ اس طرح ان کے اعمال شنیعہ منکشف ہو جاتے۔ تاہم ان کا چہرہ موتی کی طرح دمکتا تھا۔ وہ اتنے تازہ دم نظر آ رہے تھے جیسا کہ سولہ سالہ نوجوان ہو۔ ان کی جلد کئی رنگوں میں بدلی ہوئی نہیں تھی۔ نہ ہی ان کی آنکھیں یا زبان باہر کو لٹکی ہوئی تھیں۔ جس طرح ان آدمیوں کی جنہیں ضیاء نے سرعام پھانسی دلوائی تھی۔

مذہبی روایات کے مطابق میں نے بھٹو صاحب کے چہرے کا رُخ مغرب یعنی مکہ کی جانب کر دیا ان کی گردن ٹوٹی ہوئی نہیں تھی۔ ان کے گلے پر عجیب طرح کے سرخ اور سیاہ نشان تھے جیسے کسی سرکاری مہر کے ہوتے ہیں۔ کرنل بہت ناراض ہوا۔ ۱۴۰۰ سے ۱۵۰۰ لوگ دیہات کی جانب سے آگے بڑھتے آ رہے تھے اور شہید کے چہرے پر چمک کو دیکھنے کے لیے بیتاب نظر آتے تھے۔ ان کی چیخیں دلدوز تھیں۔ کرنل نے لوگوں کو منتشر نہ ہونے کی صورت میں لاٹھی چارج کی بھی دھمکی دی۔ ''دفنانے کا عمل فوراً مکمل کیا جائے'' اس نے کہا۔ ''ضرورت پڑی تو ڈنڈے کے استعمال سے بھی احتراز نہیں کریں گے۔''

''وہ غم سے چلا رہے ہیں اور ان کے دل ٹوٹ چکے ہیں'' میں نے کہا۔

بندوقوں کے جلو میں ہم نے مرحوم کو آخری دعاؤں کے ساتھ دفن کیا۔ مرحوم کی روح کو ثواب پہنچاتے ہوئے ہم ان کی میت کو قبر میں اتارا۔ قرآن کی تلاوت بھی جاری تھی اور دیہات کے گھروں میں سے عورتوں کی آہ و زاری کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔''

www.bhutto.org

3

''میر شاہ نواز بھٹو''

بھٹو فیملی کے دوسرے مقتول میر شاہ نواز بھٹو ٹھہرے۔ شاہ نواز کو جہاں وراثتی طور پر گفتار پر قدرت حاصل تھی۔ وہاں قدرت نے انہیں منفرد مزاج عطا کیا تھا۔ بچپن سے ہی ان کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز نہایت خوبصورت و نفیس تھا۔

جس کا واضح ثبوت وہ ۔۔۔۔۔۔

کانفرنس ہے جو شاہنواز بھٹو نے صرف بارہ (۱۲) برس کی چھوٹی و معصوم عمر میں کی۔ اس پریس کانفرنس سے میر شاہنواز بھٹو نے ایک پختہ سیاستدان کی طرح خطاب کیا۔ اس کانفرنس میں میر شاہ نواز نے اس طرح منطق و استدلال سے کام لیا کہ بعد ازاں ۔۔۔ شہید جمہوریت ذوالفقار علی بھٹو اپنی انتخابی مہمات میں میر شاہنواز کو ساتھ رکھتے تھے جس کی بنیادی وجہ صرف زور بیاں نہ تھا۔ بلکہ اپنی ذمہ داریوں سے کما حقہ آگاہی تھی۔ میر شاہنواز کو سیاست سے خاص لگاؤ تھا۔ جس کی مثال امریکن سکول اسلام آباد ہے۔ جہاں سے شاہنواز بھٹو کی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا تھا۔

امریکن سکول اسلام آباد میں طلباء کی یونین کا کوئی رواج و تصور نہ تھا۔ یہاں شاہنواز بھٹو نے ۔۔۔۔۔ طلباء کی یونین سازی کی بنیاد رکھی۔ نہ صرف یونین کی ابتداء کی بلکہ طلباء یونین کو مضبوط و مربوط بنیادوں پر استوار کر دیا۔ بعد ازاں شاہنواز بھٹو نے یہاں پر نچلے طبقے کے ملازمین ۔۔۔ کے جائز حقوق اور جائز مراعات کے لیے بھی یونین قائم کی۔ حتیٰ کہ طلباء و ملازمین کے جائز حقوق کے لیے ایجی ٹیشن بھی کروایا جس پر امریکن

www.bhutto.org

شاہنواز بھٹو

www.bhutto.org

سکول اسلام آباد کے پرنسپل نے ذوالفقار علی بھٹو سے شکایت کی جس پر شہید بھٹو نے شاہ نواز کی نہ صرف زبانی کلامی سرزنش کی بلکہ عملاً امریکن سکول اسلام آباد سے امریکن سکول ایبٹ آباد منتقل کر دیا۔

لیکن یہاں بھی سیاسی طبع و سیاسی رجحان کا عمل جاری رہا۔ یہاں نئے سرے سے یونین سازی کی اور ایک مرتبہ پھر نوبت ایجی ٹیشن تک جا پہنچی۔ دوبارہ شکایت اور دوبارہ سزا یقینی تھی لہٰذا میر شاہنواز بھٹو کو بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بھجوا دینے کا فیصلہ صادر کیا گیا۔ بیرون ملک جانے سے قبل میر شاہنواز بھٹو نے حسن ابدال کیڈٹ کالج سے فنشس اور ایکسر سائز کا چند ہفتوں پر مشتمل کورس مکمل کیا۔ حسن ابدال کیڈٹ کالج سے ۔۔۔۔۔ مذکورہ کورس مکمل کرنا اور امتیازی نمبروں سے پاس کرنا چونکہ مشکل کام تھا اور ایک اعزاز تھا کہ جس کی توقع ایک وزیر اعظم کے بیٹے سے نہیں کی جا رہی تھی۔ اس کامیابی پر بھٹو فیملی کے افراد کو ایک خوشگوار حیرت ہوئی۔ بیرون ملک تمام افراد خانہ نے ہارورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی لیکن میر شاہنواز بھٹو نے اپنی فیملی کے برعکس ۔۔۔۔۔ اپنے لیے سوئزرلینڈ کے شہر لائزن کے امریکن سکول کو منتخب کیا۔

شہید شاہنواز بھٹو طبقاتی اونچ، نیچ، ذات پات کے فرق سے سخت نفرت کرتے تھے۔ غریبوں کے دکھ درد کا ساتھی بننے کا عزم رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دکھ درد کو سمجھنے کے لیے ایک مرتبہ میر شاہنواز بھٹو اپنے بڑے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو کے ہمراہ لاہور کے دور دراز علاقوں بالخصوص ان علاقوں میں نکل گئے کہ جہاں غربت و افلاس کے ہاتھوں میں انسانیت کی تذلیل ہو رہی تھی۔ قبر نما جھونپڑوں میں زندگی سانس لینے پر مجبور تھی کہ جہاں انسانیت کے زوال کے ساتھ تعفن و گندگی اپنے عروج پر تھی۔ میر مرتضیٰ اور میر شاہنواز کئی گھنٹے تک اس طرح کے بھیانک منظر دیکھتے رہے دوپہر کو سڑک کنارے زمین پر بیٹھ کر نان چنے کھائے۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا" کیسے ان لوگوں کے حالات بہتر کیے جا سکتے ہیں؟ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم صدیوں پرانے زمانے میں آ گئے ہیں۔" تو میر شاہنواز نے فوراً کہا" ہمیں بدلنا ہے، یہ سب کچھ بدلنا ہے یہ اس وقت ممکن ہو گا کہ جب ہم ان لوگوں کے درمیان رہ کر کام کریں گے۔"

روایات کو توڑنا انفرادیت ہوا کرتی ہے اور یہی انفرادیت انسان کو منفرد بناتی

www.bhutto.org

ہے۔ یہی وجہ تھی کہ شاہنواز بھٹو نے 70 کلفٹن کے لان کے ایک کونے پر گھاس اور تنکوں کی ایک جھونپڑی بنوائی بغیر بستر کے اس میں ایک چارپائی بچھوا دی۔ میر شاہنواز بھٹو گھنٹوں اس چارپائی پر سوتے اور سوچتے رہتے۔ گرمی اور موسمی تکالیف کا اندازہ کرتے۔ اور ان تکالیف کا موازنہ ان لوگوں کی تکالیف سے کرتے جو اپنی تمام زندگی ان تکلیفوں اور اذیتوں سے عبادت کر رہے تھے۔" علاوہ ازیں"

المرتضیٰ میں۔۔۔۔۔ اسکاؤٹنگ کیمپ ان کی عام انسانوں جیسی زندگی کا جیتا جاگتا ثبوت تھا کہ جہاں میر شاہنواز بھٹو اپنے تمام کام خود کرتے اور ہر شام اپنے ملازمین کے ساتھ ان کی تکالیف و پریشانیوں پر گفتگو کرتے۔ علی ہذا القیاس ان تمام باتوں کو ریسرچ ورک کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس ریسرچ ورک اور عملی ایکسرسائز سے دکھ درد کو سمجھنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تاکہ آئندہ وقتوں میں سول سوسائٹی کی مجبوری و مہجوری کو آزادی سے تعبیر کیا جا سکے۔ مگر افسوس کہ وقت نے مہلت نہ دی دوسروں کے درد والم کو ختم کرنے کی خواہش رکھنے والا خود جلا وطنی کا شکار ہو گیا۔ سراغ رسانی کے نظام سے دلچسپی رکھنے والا خود سراغ رسانی کی زد میں آ گیا۔

" جیسا کہ قیام پاکستان سے قبل ہندی مسلم تاریخ اور قیام پاکستان کے بعد پیپلز پارٹی کی شروعات تک غیر متنازعہ و غیر جانبدار تحقیق سے واضح ہے کہ بوجوہ حکمران خواہ ان کا تعلق قیام پاکستان سے قبل تھا یا قیام پاکستان کے بعد" سول سوسائٹی" کی مضبوطی سے قاصر رہے۔"

اسی لیے یہ کہنا درست ہے کہ شہید ذوالفقار علی بھٹو۔۔۔۔۔ سول سوسائٹی کی مضبوطی کے لیے جنگ لڑتے ہوئے تختہ دار تک جا پہنچے۔ بلکہ یوں کہنا میرے نزدیک زیادہ بہتر ہے کہ "شہید ذوالفقار علی بھٹو نہیں بلکہ عوام کی حکومت، عوام کے لیے، عوام کے ذریعے تختہ دار تک جا پہنچی۔ شہید ذوالفقار علی بھٹو کا عدالتی قتل دراصل جمہوریت، غریب عوام کی امیدوں اور سول سوسائٹی کی مضبوطی کا عدالتی قتل تھا۔ عظیم والد، عظیم قائد اور مجبور عوام کی امید کو رجعت پسندوں نے بین الاقوامی سازش کے تحت جس سفاکی و بربریت سے قتل کیا اس کے بعد بحیثیت جرأت مند بیٹے میر شاہنواز بھٹو نے اپنے والد کے افکار اور مقصد کو پایہ تکمیل پہنچانے کی غرض سے "عملی" جدوجہد کا آغاز کیا۔ میر شاہنواز بھٹو نے اپنی اس

www.bhutto.org

جدوجہد کے دوران یورپ میں ایک انٹرویو دیا۔ اس انٹرویو کا ایک ایک لفظ ایک ایک جملہ ان کی جدوجہد کی وجہ و مقصد کا عکاس ہے۔

''یہ درست ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو میرے والد ہیں۔ انہیں شہید کیا گیا ہے۔ لیکن میں اس سارے عمل کو قوموں کی آزادی کے تاریخی عمل کے حوالے سے دیکھتا ہوں۔ ذوالفقار علی بھٹو تاریخ کا ایک عمل ہیں۔ انہوں نے پاکستان کے غریب، بے بس اور مجبور انسانوں کو ظلم و جبر سے نجات دلانے کی جدوجہد کی قیادت کی ہے۔ انہوں نے تیسری دنیا کی غلام قوموں کے سامراج کے خلاف زبردست جنگ کا ساتھ دیا ہے۔ انہوں نے اسلامی دنیا کے عوام کو خواب غفلت سے جگانے کی کوششوں میں بھرپور حصہ لیا ہے نیز دنیا کو ظلم و ستم کی آماجگاہ بنانے کے خلاف جنگ میں سپاہی کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی ہے۔ انہوں نے جہالت کے خلاف مادی طور پر جنگ میں حصہ لیا ہے۔ وہ تاریخی عمل کے ساتھ چلے۔ انہوں نے تاریخ کے عمل کو تیز کیا ہے۔ ان کا قتل تاریخی عمل کا قتل ہے۔ حریت فکر کا قتل ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک کی جدوجہد کا قتل ہے۔ یہ محض ایک شخص کا قتل نہیں ہے۔''

''میر شاہنواز بھٹو'' نے اپنے شہید والد کا تاریخی عمل، فکر حریت اور تیسری دنیا کے ممالک کی ترقی و حقوق کی پاسداری کے لیے نیز جمہوریت کی بحالی ایک آمر اور اس کے حواریوں سے نجات کے لیے افغانستان، لیبیا، شام اور فرانس تک کے سفر کیے۔ یقیناً یہ کام شاہنواز کا شوق نہیں تھا بلکہ اس نظریے کی پاسداری تھی ۔۔۔۔۔ جو شہید ذوالفقار علی کا مشن تھا۔ اسی فطری رویے کے پیش نظر ۔۔۔۔۔ شاہنواز نے پاکستان کے جمہوریت پسند جوانوں کو کابل میں اکٹھا کرنا شروع کیا بعد ازاں ان کی نظریاتی تربیت کی تاکہ وہ پاکستان میں موجود آمر اور اس کے حواریوں کا سامنا کر سکیں اور اسلامی ''جمہوری'' مملکت پاکستان سے آمریت کا خاتمہ کر سکیں۔ شاہنواز بھٹو اپنا یہ مقصد مکمل کرنے کے لیے عزم و استقلال، جرأت، حوصلہ اور جنونی جذبہ کے تحت اپنا کام سرانجام دیتے رہے۔ شاہنواز جمہوریت پسند ساتھیوں کے ساتھ آزادی جمہوریت کی جنگ لڑنے کے لیے خود کو اور ساتھیوں کو سخت آزمائشوں سے گزارتے۔ جذبے کا عالم یہ تھا کہ کابل میں کرفیوں نافذ تھا۔ ہر طرف روسی فوج کا محاصرہ تھا۔ لیکن خود کو آزمانے کی غرض سے شاہنواز رات گئے سڑکوں پر نکل کھڑے

www.bhutto.org

ہوئے۔

میر شاہنواز بھٹو سے ان کی افغان نژاد اہلیہ اکثر و بیشتر اصرار کرتیں کہ وہ کابل اور شام میں اپنی سرگرمیاں ختم کر کے امریکہ منتقل ہو جائیں اور اپنا کاروبار شروع کر لیں۔ مگر شاہنواز بھٹو اس مشورے کو سختی سے رد کر دیتے اور ہمیشہ ان کا ایک ہی جواب ہوتا کہ "میں اپنے وطن کے مظلوم و بے بس لوگوں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ ان کی آزادی (جمہوریت) کے لیے ہمہ وقت جدوجہد کرتا رہوں گا۔ مجھے اپنے والد کا مشن مکمل کرنا ہے خواہ اس میں ان کی جان کیوں نہ چلی جائے۔

کابل میں میر شاہنواز اور مرتضیٰ بھٹو کی بیگمات کے خاندانی ملازم نے دونوں بھائیوں کے کھانے میں زہر ملا کر ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ کھانا وفادار کتے نے کھا لیا اور چند لمحوں میں مر گیا۔ بعد ازاں اس سازش کو بے نقاب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس ملازم کو افغان کے ایک گروہ نے خطیر رقم دی تھی کہ وہ دونوں بھائیوں میر شاہنواز اور میر مرتضیٰ کو قتل کر دے تاکہ وہ گروہ اس وقت کے پاکستانی آمر اور اس کے حواریوں کی ہمدردیاں حاصل کر سکے۔ میر شاہنواز اور میر مرتضیٰ نے اس ملازم کو آخر وقت تک اس لیے زندہ چھوڑ دیا کہ ان دونوں بھائیوں کی بیگمات نے اس ملازم کو معاف کر دینے کی سفارش کی تھی۔

اسی طرح کابل کی شاہراہ پر دوران سفر شہید بھٹو کے صاحبزادوں کو قتل کرنے کی ایک اور کوشش کی گئی گولی چلائی گئی لیکن خوش قسمتی سے نشانہ خطا ہوا اور کار کی سیٹ میں گولی پیوست ہو گئی۔ اس کے بعد شاہنواز بھٹو اور میر مرتضیٰ بھٹو کو اطلاع ملی کہ پانچ کمانڈوز پر مشتمل ایک دستہ تیار کیا گیا ہے تاکہ میر مرتضیٰ بھٹو اور میر شاہنواز بھٹو کو قتل کیا جا سکے۔ یہی وجہ تھی کہ بینظیر بھٹو نے میر شاہنواز بھٹو کو کئی مرتبہ مشورہ دیا کہ "وہ عملی جدوجہد کی بجائے سیاسی جدوجہد کا آغاز کریں" لیکن شاہنواز بھٹو ہمیشہ اس مشورے کی نفی کرتے۔ شاہنواز بھٹو کا فطری رجحان و میلان جاسوسی کی طرف تھا۔

رپورٹس تیار کرنے اور مخالفین کی رپورٹس حاصل کرنے نیز مخالفین کی دہشت گرد کارروائیوں اور منصوبوں کو ناکام بنانے میں ان کا ذہن جادوئی طاقت رکھتا تھا۔ یہ اسی جادوئی طاقت کا ردِ عمل تھا کہ ضیاء الحق جو منصوبہ بندی کرنے اور ٹھکانے لگانے میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا تھا۔ 1979ء سے 1984ء تک میر مرتضیٰ بالخصوص میر شاہنواز کو ختم

www.bhutto.org

کرنے میں ناکام رہا۔ 10 جنوری 1984ء کو محترمہ بینظیر بھٹو کو علاج کے لیے بیرون ملک جانے کی اجازت ملی۔ یقیناً ضیاء الحق کے سازشی ذہن کی شکست کے اور ۔۔۔۔ دشت گردی کی وارداتوں کو ناکام بنانے والے شاہنواز بھٹو کے ذہن کی فتح تھی۔ ''کیونکہ''

ضیاء الحق اور ان کے حواریوں کے خیال میں محترمہ بینظیر بھٹو کی رہائی شاہنواز اور میر مرتضٰی کے جوش کو ٹھنڈا کرنے میں مددگار ثابت ہو گی۔ بیگم نصرت بھٹو ایم آر ڈی کی تحریک کی ناکامی سے خاصی دلبرداشتہ تھیں۔ اور پھر جب تک افغانستان میں روس کی فوج موجود ہے۔ ضیاء الحق کو منظر سے ہٹانا جان جوکھوں کا کام تھا۔ اسی دوران ضیاء الحق نے مجلس شوریٰ کا نظام متعارف کرایا۔ 1981ء تا 1985ء تک یہ نظام چلتا رہا۔ اسلامی نظام کے نفاذ پر ضیاء الحق نے 1984ء میں ریفرنڈم کا انعقاد کیا اور آئندہ پانچ سال کے لیے صدر بن بیٹھا۔ 1984ء کے آخر میں میر شاہنواز کی پالیسیوں سے پریشان و عاجز آ کر ضیاء الحق نے اپنے حواریوں کے ذریعے میر مرتضٰی اور بالخصوص میر شاہنواز کو پیغام بھجوایا کہ ''اگر میرے (ضیاء الحق) قتل کرنے کی منصوبہ بندی کا سلسلہ جاری رہا تو اسی قسم کی کارروائی بھٹو خاندان کے خلاف بھی کی جا سکتی ہے۔''

یہ الگ بحث کے ضیاء الحق بھٹو خاندان کے خلاف اس کارروائی کو شہید ذوالفقار علی بھٹو کی صورت عملی مظاہرہ کر چکا تھا۔ نیز ضیاء الحق ۔۔۔۔ پانچ تربیت یافتہ کمانڈوز کے ذریعے میر شاہنواز اور میر مرتضٰی کے درپے تھا۔ مختصراً یہ کہ جنوری 1985ء میں ضیاء الحق کو آگاہ کیا گیا اور طے پایا کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے گی۔ محترمہ بےنظیر بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو کی بھی یہی خواہش تھی کیونکہ ضیاء الحق ماضی کی طرح ایک مرتبہ پھر انتخابات کی تاریخ کا اعلان کر چکا تھا۔ اس مرتبہ ضیاء الحق نے غیر جماعتی انتخابات کرا دیے جس کا پیپلز پارٹی نے بائیکاٹ کیا۔

5 مارچ 1985ء کو ناصر بلوچ اور 26 مارچ 1985ء کو ایاز سموں کو پھانسی دے دی گئی۔ ان کی پھانسی کے بعد شاہنواز ایک مرتبہ پھر سرگرم ہو گئے۔ اب شاہنواز بھٹو بے گناہوں کے قتل عام پر خاموش تماشائی نہیں بن سکتے تھے۔ اس کا اظہار انہوں نے اپنی والدہ بیگم نصرت بھٹو سے کیا جب اس بات کا علم محترمہ بےنظیر بھٹو کو بھی ہو گیا کہ میر شاہنواز بھٹو ذہنی الجھن اور کشمکش کا شکار ہے تو جولائی 1985ء کو محترمہ بینظیر بھٹو اور ان کی والدہ بیگم

www.bhutto.org

نصرت بھٹو فرانس کے شہر کینز پہنچ گئیں۔ جہاں میر مرتضیٰ بھٹو پہلے سے موجود تھے بعد میں صنم بھٹو بھی فرانس پہنچ گئیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ

میر شاہنواز بھٹو کی ازدواجی زندگی 83-1981ء تک خاصی پر لطف اور پرسکون تھی لیکن 85-1984ء میں ان کی ازدواجی زندگی جھگڑوں کا شکار ہوگئی۔ جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان کی بیوی افغان نژاد ریحانہ کے پاکستان انٹیلی جینس ایجنسیوں سے روابط تھے۔ اس بات کا علم میر شاہنواز بھٹو کو ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں کے درمیان تعلقات کی خلیج بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ نوبت علیحدگی تک جا پہنچی تھی۔ مگر علیحدگی میں میر شاہنواز بھٹو کی تین سالہ بیٹی ''ستی'' حائل تھی۔ ضیاء الحق کے سازشی ذہن کا مقابلہ کرنے کے لیے میر شاہنواز ہمہ وقت تیار رہتے تھے متعدد مرتبہ قتل کے منصوبوں کا سامنا کر چکے تھے جس میں قسمت نے اب تک یاوری کی تھی۔ چونکہ شاہنواز بھی ضیاء الحق اور اس کی سفاک آمریت کے خاتمے کے لیے جارحانہ انداز اپنائے ہوئے تھے۔ ضیاء کے خلاف اپنے عزائم کے بھیانک نتیجہ سے بھی شاہنواز واقف تھے۔ اس لیے وہ اپنے پاس ہمہ وقت تیز ترین زہر رکھتے تھے کہ جس کے کھانے کے بعد چند سیکنڈز میں زندگی موت کی آغوش میں چلی جائے۔ 17 جولائی 1985ء کو کئی سالوں بعد بھٹو فیملی کے تمام افراد نے مل کر رات کا کھانا کھایا اور دیر گئے تک خوش کن ماحول میں باتیں کرتے رہے اسی رات (17 جولائی 1985ء) کو فرانس کے سفارت خانے میں تعینات ایک افسر نے ضیاء الحق کو بھٹو فیملی کے متعلق معلومات فراہم کیں اور بھٹو فیملی کی فرانس کے شہر کینز۔۔۔۔ میں موجودگی کی اطلاع کی۔ اس قدر خفیہ اور حساس معلومات کے بعد نجانے ضیاء الحق نے شاہنواز بھٹو کے متعلق کیا فیصلہ کیا؟

لیکن یہ ۔۔۔۔۔ حقیقت ہے کہ جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگلے روز 18 جولائی 1985ء کو میر شاہنواز بھٹو اپنے فلیٹ میں مردہ پائے گئے۔ پیپلز پارٹی کی مرکزی قیادت نے میر شاہنواز بھٹو کے قتل کا الزام ضیاء الحق پر عائد کیا لیکن اس کا ثبوت کسی کے پاس نہیں تھا۔ دوسری طرف میر شاہنواز بھٹو کی اہلیہ ریحانہ نے بیان دیا کہ میر شاہنواز بھٹو نے خودکشی کی ہے۔ جبکہ ردعمل میں محترمہ بینظیر بھٹو اور میر مرتضیٰ بھٹو اس بیان کی نفی کر رہے تھے۔ بعد میں میر کی اہلیہ ریحانہ نے تسلیم کیا کہ اس نے میر شاہنواز کے کراہنے کی

www.bhutto.org

آواز سنی تھی۔ جس رات شاہنواز کی موت واقع ہوئی اس رات ان کی اہلیہ ریحانہ ان کے ساتھ تھی اور دوسرے کمرے میں سو رہی تھی جس وقت شاہنواز بھٹو کی جان نکل رہی تھی اور وہ کراہتے رہے نجانے وہ کیا وجہ تھی کہ ان کی اہلیہ ریحانہ نے توجہ تک دینا گوارہ نہ کیا؟ اسی بنیاد پر فرانس پولیس نے ریحانہ کو گرفتار بھی کیا۔ فرانس کی انٹیلی جنس تمام تر وسائل کی موجودگی کے باوجود میر مرتضیٰ بھٹو کے قاتل کا سراغ لگانے میں ناکام رہی۔

البتہ میر مرتضیٰ بھٹو نے اپنا انٹیلی جنس ونگ قائم کیا ہوا تھا جس کی کئی سالوں کی کوششوں سے صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ جس رات ''میر شاہنواز بھٹو'' کی موت واقع ہوئی اس رات ایک مرسڈیز گاڑی ان کے فلیٹ کے سامنے ان کی موت سے چند گھنٹے پہلے رکی جس میں سے چند افراد برق رفتاری سے میر شاہنواز بھٹو کے کمرے میں گئے اور چند لمحوں بعد اسی برق رفتاری سے واپس گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ 19 جولائی 1985ء کو شاہنواز بھٹو کی موت کی خبر پوری دنیا سمیت پاکستان میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ فرانس حکومت نے 6 اگست 1985ء کو شاہنواز بھٹو کی نعش بھٹو فیملی کے حوالے کر دی۔ اس دوران فیصلہ کیا گیا کہ میر شاہنواز کو ان کے وطن پاکستان میں آبائی قبرستان گڑھی خدا بخش میں دفن کیا جائے گا اور میر شاہنواز کی جسد خاکی لے کر محترمہ بینظیر بھٹو پاکستان جائیں گی۔

پاکستان واپسی کے لیے فرانس میں موجود پاکستان سفارت خانے نے کاغذات کی تیاری کے لیے خاصا وقت ضائع کیا اور بالآخر 21 اگست 1985ء کو پاکستان جانے کی اجازت دی یقیناً اس دیر کی وجہ یہ تھی کہ ضیاء الحق نہیں چاہتا تھا کہ ''شاہنواز بھٹو'' پاکستان میں دفن ہوں۔'' فرانس سے روانگی سے قبل محترمہ بینظیر بھٹو نے مخدوم خلیق الزمان کو شاہنواز بھٹو کی تجہیز و تکفین کے لیے کہا۔ مخدوم خلیق الزمان شاہنواز بھٹو کے کزن مشتاق بھٹو کے ساتھ مل کر تجہیز و تکفین کا بندوبست کر رہے تھے کہ انہیں گرفتار کرا لیا گیا۔ یہ سفاکی کی معراج تھی۔۔۔۔۔۔ دنیا بھر سے تعزیتی پیغام آ رہے تھے اور بھٹو فیملی کے سربراہ میر نبی بخش آنکھوں میں آنسو لیے تعزیتی پیغامات وصول کر رہے تھے۔ دوغلہ پن خود سے اس وقت شرمندہ تھا کہ جب اس وقت کے وزیر اعظم (غیر جماعتی) محمد خاں جونیجو کے ساتھ ضیاء الحق نے بھی شاہنواز بھٹو کی ناگہانی موت پر تعزیتی پیغام بھجوایا۔ ایک طرف تعزیت اور

www.bhutto.org

دوسری طرف تجہیز و تکفین میں رکاوٹیں اسے کیا کہیے؟ سیاست، منافقت یا دوغلہ پن؟

21 اگست 1985ء کو محترمہ بینظیر بھٹو اپنے چہیتے اور سب سے چھوٹے پیارے بھائی کا تابوت لے کر پاکستان پہنچیں۔ مولانا احترام الحق تھانوی نے نماز جنازہ پڑھائی اور 23 اگست کو سوئم کہ جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ اور 27 اگست 1985ء کو ضیاء الحق کے حکم کے عین مطابق محترمہ بینظیر بھٹو کو 3 ماہ کے لیے 70 کلفٹن میں نظر بند کر دیا گیا۔ حالانکہ بین الاقوامی سطح پر یقین دلایا گیا تھا کہ بینظیر بھٹو صاحبہ کو گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ لیکن ضیاء الحق ۔۔۔۔۔۔ وعدہ خلافی کی فطرت سے باز نہ آیا۔

یکم ستمبر 1985ء کو امریکی سفیر ڈین ہنٹن نے گورنر جنرل جہانداد (سندھ) سے ملاقات کی اور محترمہ کی گرفتاری پر تشویش ظاہر کی لیکن افغانستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر ضیاء الحق نے واشگاف الفاظ میں امریکی سفیر پر واضح کیا کہ محترمہ کی گرفتاری پاکستان کا اندرونی مسئلہ ہے لہٰذا امریکی حکم نامہ کے تحت کسی کو گرفتار یا رہا نہیں کیا جائے گا۔ لیکن بین الاقوامی دباؤ بڑھتا گیا اور ضیاء الحق کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ ایک ماہ 5 دن کے بعد نظر بندی ختم کر دی گئی۔ البتہ محترمہ بینظیر بھٹو کو 3 نومبر 1985ء کو ہی سخت حفاظتی اقدامات کے ساتھ واپس فرانس بھیج دیا گیا۔ بھٹو فیملی کا سب سے کم عمر جوان میر شاہنواز بھٹو صرف 27 سال کی عمر میں سول سوسائٹی کی بالا دستی کے لیے کوشاں خالق حقیقی سے جا ملا۔ اور شہید حریت کہلایا۔۔۔۔۔۔۔۔

www.bhutto.org

4

"میر مرتضیٰ بھٹو"

1977ء کا بدترین مارشل لاء جب اسلامی مملکت خداداد پاکستان میں نافذ ہوا۔۔۔۔تو اس وقت محترمہ بینظیر بھٹو کی عمر 24 برس کی تھی جبکہ میر مرتضیٰ بھٹو 23 برس کے تھے اس طرح صنم بھٹو 21 سال اور میر شاہنواز 20 سال کے تھے۔

شہید ذوالفقار علی بھٹو نے وقت و حالات کی نزاکت اور تقاضے کے عین مطابق اپنے صاحبزادوں میر مرتضیٰ بھٹو اور میر شاہنواز بھٹو کو بیرون ملک بھجوا دیا۔ میر شاہنواز بھٹو تو اپنی والدہ بیگم نصرت بھٹو کے صرف ایک مرتبہ کہنے پر چلے گئے جبکہ میر مرتضیٰ بھٹو اس کڑے وقت میں کہ جب فخر ایشیاء و قائد عوام مقید تھے۔ بیرون ملک جانے پر رضا مند نہ تھے۔ شہید ذوالفقار علی بھٹو کے بار بار اصرار اور بالآخر سختی سے کہنے پر دیار غیر چلے گئے۔

لیکن ذوالفقار علی بھٹو نے بیگم نصرت بھٹو اور بینظیر بھٹو کو پاکستان میں ہی رہنے کے لیے کہا۔ نتیجتاً دونوں کو قید و بند کی صعوبتیں اُٹھانا پڑیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت تک محترمہ بینظیر بھٹو سیاسی اسرار و رموز سے کافی حد تک واقف ہو چکی تھیں اور ذوالفقار علی بھٹو اپنی زندگی کے آخری دنوں میں محترمہ کو آنے والے آمرانہ دور کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے۔ اور پھر ایسا ہی ہوا کہ جس کا نتیجہ آج تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھا جا چکا اور لکھا جاتا رہے گا کہ محترمہ بینظیر بھٹو کی سیاسی حکمت عملی اس حد تک کارگر رہی کہ وہ تا دم تحریر ملک کی پہلی خاتون وزیر اعظم بنیں اور۔۔۔۔وزارت عظمیٰ کی مسند پر دو مرتبہ فائز ہوئیں۔ اس سے قبل پاکستانی تاریخ سیاست میں دو مرتبہ وزارت عظمیٰ کا اعزاز ان کے والد شہید ذوالفقار علی بھٹو کو حاصل تھا۔

www.bhutto.org

علاوہ ازیں۔۔۔۔اپنے صاحبزادوں میر مرتضیٰ بھٹو اور میر شاہنواز بھٹو کے بیرون ملک بھجوانے کا فیصلہ ذوالفقار علی بھٹو نے اس لیے بھی کیا کہ وہ۔۔۔۔یہ نہیں چاہتے تھے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی طرح ان کے خاندان کو کسی سازش کے تحت قتل کر دیا جائے۔اور دوسری وجہ یہ تھی کہ مارشل لاء کے نفاذ سے قبل میر مرتضیٰ بھٹو عملی طور پر سیاست میں آنے سے پہلے اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتے تھے۔وقت حالات کی ستم ظریفی کہ میر مرتضیٰ بھٹو کو وقت سے پہلے جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا۔اپنی جلاوطنی کی شروعات میں ہی میر مرتضیٰ بھٹو اپنے والد کی رہائی کے لیے کوشاں ہو گئے۔بین الاقوامی سطح پر سربراہان مملکت بالخصوص اسلامی ممالک کے سربراہان سے ملاقاتوں کا تھکا دینے والا سلسلہ شروع کیا۔مختلف ممالک کے مختلف نمائندوں سے رابطے اور ملاقاتیں کیں۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ضیاء الحق بین الاقوامی اور بالخصوص اسلامی ممالک سے ''وقتی طور پر'' یہ وعدہ کرنے پر مجبور ہو گیا کہ اس کی حکومت ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف کوئی انتہائی قدم نہ اُٹھائے گی۔

4اپریل 1979ء کو جب ضیاء الحق نے عہد شکنی کرتے ہوئے ''بھٹو'' کو تختہ دار پر چڑھا دیا تو میر مرتضیٰ بھٹو نے بھی ضیاء الحق کے خلاف سیاسی جدوجہد کی بجائے عملی کارروائی کی ٹھان لی۔اسی لیے میر مرتضیٰ بھٹو نے باقاعدہ فوجی تربیت بھی حاصل کی۔دریں اثناء ملک میں مظاہرے اور احتجاج ہوا جس کے نتیجے میں ضیاء الحق نے شاہی قلعہ جو بذات خود ایک تاریخی ورثہ ہے اسے عقوبت خانے میں بدل کر نئی و منفی تاریخ رقم کی اس عقوبت خانے میں پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو قید کیا گیا۔مختلف قسم کی المناک اور خوفناک سزائیں دی گئیں کوڑوں سے لے کر برف کے بلاکوں پر لٹانے تک اور بالوں سے لے کر ناخن تک کھنچوائے گئے۔

مختلف اذیتوں اور کرب مسلسل سے گزرنے کے بعد بدلے کی آگ اپنے سینوں میں لیے جب بھی کارکن رہا ہوتے۔مخفی طریقوں سے میر مرتضیٰ بھٹو سے جا ملتے۔اس طرح روز بروز میر مرتضیٰ بھٹو کی اندرون و بیرون ملک افرادی قوت بڑھتی چلی گئی۔بلاشبہ میر مرتضیٰ بھٹو ضیاء الحق کو ختم کرنا چاہتے تھے اسی طرح بھٹو کے صاحبزادوں کو ضیاء الحق بھی پسند نہ کرتا تھا۔لیکن دونوں حملہ کرنے کے باوجود ناکام ہو جاتے اس میں کوئی کلام نہیں کہ ضیاء الحق کی انٹیلی جنس کمال کی تھی جو بروقت اطلاع کر دیتی اور دوسری طرف میر مرتضیٰ بھٹو

www.bhutto.org

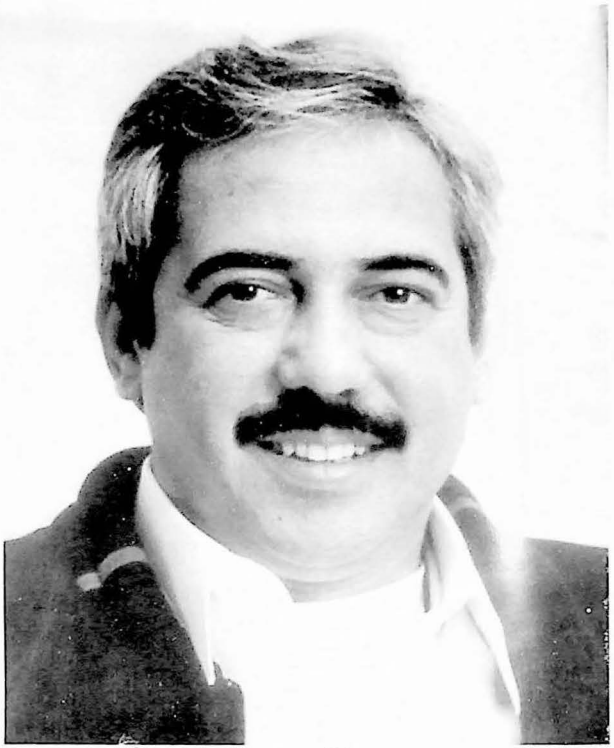

مرتضیٰ بھٹو

www.bhutto.org

بھی اپنی باصلاحیت انٹیلی جنس رکھتے تھے۔

ضیاء الحق نے مارشل لاء کے دور میں قابل ذکر تین ممالک مصر، شام اور لیبیا میں موجود پاکستانی سفارت خانوں میں خصوصی طور پر حساس اداروں کے اہلکاروں کو تعینات کیا ۔ یہ اہلکار وعہدے دار میر مرتضیٰ بھٹو کی تمام سرگرمیوں کا جائزہ لیتے۔ اسی وجہ سے کوئی دن ایسا نہ ہوتا کہ ضیاء الحق کو میر مرتضیٰ بھٹو کی رپورٹ نہ ملتی۔ پاکستان پیپلز پارٹی سے کسی طرح بھی تعلق رکھنے والے لوگوں کو جب قید و بند، سزائیں، کوڑے اور جرمانوں کا سامنا کرنا پڑا تو ان کارکنوں کے پاس ملک چھوڑ دینے کے علاوہ کوئی راستہ نہ رہتا۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے آمرانہ جال سے بچ جانے والے ان کارکنوں کی افغانستان اور شام میں نظریاتی و عملی تربیت کی۔ ایک طرف میر مرتضیٰ بھٹو یہ عزم رکھتے تھے کہ وہ اپنے باپ کے قاتل کو کسی صورت معاف نہ کریں گے۔ جبکہ دوسری طرف پاکستان میں سیاسی و مذہبی قائدین جو بھٹو حکومت کے خاتمہ میں پیش پیش رہے تھے اب انتخابات کو یقینی بنانے کے لیے مارچ 1981ء میں احتجاجی تحریک شروع کرنا چاہتے تھے کہ اچانک 2 مارچ 1981ء کو سلام اللہ ٹیپو، عبدالناصر خاں اور ان کے ساتھیوں نے پی آئی اے کا ایک طیارہ جس میں 148 مسافر سوار تھے ہائی جیک کر لیا۔ 29 مسافر رہا کر دیے بقیہ 119 مسافر طیارے سمیت ہائی جیک رہے۔ ہائی جیکروں نے مطالبہ کیا کہ ''92 سیاسی قیدی رہا کیے جائیں کہ جنہیں پولیس نے بے گناہ گرفتار کیا ہوا ہے۔''

''یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان مذکورہ 92 قیدیوں میں 15 ہائی جیکروں کے رشتہ دار تھے۔'' فوجی قیادت نے بیگم نصرت بھٹو سے درخواست کی جو ان دنوں کراچی جیل میں قید تھیں کہ وہ اپنے بیٹے میر مرتضیٰ بھٹو سے کہیں کہ وہ ۔۔۔۔'' ہائی جیک طیارہ و مسافروں کو رہا کروا دیں'' 7 مارچ 1981ء کو بیگم نصرت بھٹو نے فوجی حکام پر واضح کر دیا کہ'' ہائی جیکنگ کا ڈرامہ ضیاء الحق کا اپنا رچایا ہوا ہے اور ضیاء الحق چاہتا ہے کہ وہ اپنے خلاف متوقع تحریک کو با آسانی کچل سکے اور اس ہائی جیکنگ کا تعلق ان کے بیٹوں میر مرتضیٰ یا میر شاہنواز سے نہیں ہے۔''

''یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آئی ایس آئی کی رپورٹ کے مطابق ہائی جیکروں نے یہ طیارہ ایک بین الاقوامی دہشت گرد کارلوس کے تعاون سے انجام دیا تھا۔''

www.bhutto.org

8 مارچ 1981ء کو ہائی جیکرز طیارہ لے کر ۔۔۔۔ شام کے دارالحکومت دمشق پہنچ گئے شام کی حکومت سے ضیاء الحق مذاکرات کرتے رہے لیکن یہ مذاکرات ناکام ہوئے بالآخر ضیاء الحق کو ہائی جیکروں کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے اور 54 قیدی رہا کرنا پڑے اور ان کی رہائی کے عوض ہائی جیکرز نے یرغمال مسافر آزاد کر دیے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہائی جیکنگ کا منصوبہ میر مرتضیٰ بھٹو نے نہ بنایا ہو کیونکہ ضیاء حکومت میر مرتضیٰ بھٹو کی کابل میں موجودگی ثابت نہ کر سکی۔ اس تمام تر واقعہ کا ایک فائدہ میر مرتضیٰ بھٹو کو ہوا اور ایک فائدہ ضیاء الحق کو ہوا۔ مرتضیٰ اس واقعہ کے نتیجہ میں ایک مرتبہ پھر نئے انداز سے بین الاقوامی سطح پر یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گئے کہ پاکستان کے سابق وزیراعظم کے صاحبزادے نے ایک تنظیم قائم کر لی ہے جس کا مقصد پاکستان سے ضیاء الحق کی آمریت کے خاتمے کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔

اور ضیاء الحق ملک میں یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گیا کہ میر مرتضیٰ و میر شاہنواز تخریب کار ہیں اور اسی آڑ میں ضیاء الحق نے اپنے اقتدار کے خلاف اٹھنے والی تحریک ''ایم آر ڈی'' کو غیر موثر کر دیا۔ 1981ء تا 1984ء تک ایک دوسرے کے خلاف عملی محاذ آرائی اپنے عروج پر رہی۔ تنگ و عاجز آ کر بالآخر ضیاء الحق نے میر مرتضیٰ و شاہنواز بھٹو کو پیغام بھیجا کہ ''اگر یہ سلسلہ بند نہ ہوا تو اس قسم کی کارروائیاں بھٹو خاندان کے خلاف بھی ہو سکتی ہیں۔'' میر مرتضیٰ بھٹو اور میر شاہنواز نے خاصے غور و خوص اور بحث کے بعد جنوری 1985ء کو باقاعدہ ضیاء الحق کو مطلع کیا کہ اب اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے گی۔

اس معاملے کے طے ہو جانے کے بعد شواہد ثابت کرتے ہیں کہ میر مرتضیٰ بھٹو اور میر شاہنواز بھٹو مذکورہ طے شدہ معاہدے کے پابند رہے۔ لیکن وقت کی ستم ظریفی کہ اچانک 18 جولائی 1985ء کو میر شاہنواز فرانس کے شہر کینز میں اپنے فلیٹ میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد تمام سیاسی قتلوں کی طرح آج تک یہ معمہ ہے کہ میر شاہنواز بھٹو کی موت ۔۔۔۔ کس طرح واقع ہوئی؟ لیکن پیپلز پارٹی کی اعلیٰ قیادت بالخصوص بیگم نصرت بھٹو نے شاہنواز بھٹو کی اس بے وقت اور دلدوز موت کا ذمہ دار ضیاء الحق کو ٹھہرایا۔

جہاں شاہنواز کی موت تمام خاندان کے لیے صدمہ تھی وہاں میر مرتضیٰ بھٹو کے لیے دہرا صدمہ تھی۔ کیونکہ میر مرتضیٰ بھٹو کی بے بسی کی معراج تھی کہ وہ ۔۔۔ اپنے شہید

www.bhutto.org

فاطمہ بھٹو

www.bhutto.org

بھائی کا جسد خاکی لے کر فرانس سے پاکستان نہ آسکتے تھے۔ بیگم نصرت بھٹو اگرچہ مضبوط اعصاب کی مالک تھیں مگر نوجوان بیٹے کی لاش دیکھنے اور قبل ازیں اپنے شوہر کے عدالتی و آمرانہ قتل کے بعد ان میں یہ سکت نہ تھی کہ وہ اب میر مرتضیٰ بھٹو کی موت دیکھیں لہٰذا انہوں نے میر مرتضیٰ کو پاکستان کے مخصوص حالات اور پیپلز پارٹی کے خلاف حکومتی ''انتقامی کارروائیوں'' کے پیش نظر پاکستان جانے سے منع کر دیا۔ یقیناً بیگم صاحبہ اس موقف میں حق بجانب تھیں۔ مگر میر مرتضیٰ بھٹو اپنے بھائی اور ساتھی میر شاہنواز بھٹو کی آخری رسومات کندھا دینے سے تجہیز و تکفین تک میں شرکت نہ کر سکے۔

فرانس میں بیگم صاحبہ کو پاکستان کی مسندِ صدارت سے آمرانہ فرمان جاری ہوا کہ ''اگر میر مرتضیٰ بھٹو نے اپنے بھائی شاہنواز بھٹو کی موت کے بعد کوئی انتقامی کارروائی کی تو اس کے بعد کے تمام بھیانک نتائج کی ذمہ دار وہ خود ہوں گی۔'' بعد کے شواہد کے مطابق 1986ء تا 1988ء میر مرتضیٰ کی عملی جدوجہد اور تنظیم محض کاغذوں کی حد تک تھی۔ (1986ء تا 1988ء) میر مرتضیٰ بھٹو کی تمام تر توجہ اپنے کاروباری معاملات پر مرکوز رہی۔

ضیاء الحق 17 اگست 1988ء کو ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ طیارے کی تباہی کوئی معمولی حادثہ نہ تھا بلکہ ایک سازش کا نتیجہ تھا۔ اگرچہ پہلے پہل اس حادثے کی ذمہ داری میر مرتضیٰ بھٹو کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کی گئی لیکن بعد کے تحقیقی قرائن یہی ہیں کہ ۔۔۔۔ اتنے بڑے پیمانے کی سازش میر مرتضیٰ بھٹو اور اس کی تنظیم جو اس وقت محض کاغذوں کی حد تک رہ چکی تھی نہیں کر سکتی۔ یقیناً اتنی بڑی سازش کسی بڑے ملک کی انٹیلی جنس ہی کر سکتی ہے۔''

ضیاء الحق کے گزر جانے کے بعد میر مرتضیٰ بھٹو اپنی جلاوطنی ختم کر کے واپس پاکستان آنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعض اعلیٰ فوجی حکام ان کے لیے کوئی اچھے جذبات نہ رکھتے تھے۔ نیز ان کے خلاف اور بھٹو فیملی کے خلاف مقدمات درج تھے۔ اس دوران محترمہ بینظیر بھٹو 1988ء میں پاکستان کی وزیر اعظم بن گئیں۔ افسوس کہ ابھی وہ بھٹو فیملی اور بالخصوص میر مرتضیٰ بھٹو کے خلاف عائد مقدمات کا جائزہ لے رہیں تھیں کہ ان کی حکومت کے خلاف ساز باز شروع ہو گئی۔ محترمہ قطعاً یہ نہیں چاہتیں تھیں کہ وہ جلد بازی میں مقدمات ختم کروا کے سازشی عناصر کے مقاصد کو مزید تقویت دیں۔ لہٰذا میر مرتضیٰ بھٹو کی

www.bhutto.org

وطن واپسی کا یہ مناسب وقت نہ تھا۔

اگر میر مرتضیٰ بھٹو وطن واپس آ جاتے تو سازشی عناصر کے مقاصد جلد سے جلد پایہ تکمیل کو پہنچ جاتے اور پھر آئین و قانون کی مصلحتیں بھی پیش نظر تھیں۔ وقت و حالات کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میر مرتضیٰ بھٹو وطن واپسی کا ارادہ موخر کر دیا۔ محترمہ کا پہلا دور حکومت انتہائی مختصر و قلیل ثابت ہوا۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے محترمہ کے لیے پہلے دور حکومت کے خاتمہ کے بعد فوج اور انٹیلی جنس ایجنسیوں سے اپنی راہ رسم بڑھائی اور یقین دہانی کروا دی کہ ''ان کی لڑائی ضیاء الحق سے تھی اور بحیثیت ادارہ وہ (میر مرتضیٰ) فوج کی عزت کرتے ہیں نیز ان کے دل میں فوج کے لیے کوئی عداوت نہ ہے۔''

''جبکہ میر مرتضیٰ اور فوج کے درمیان رابطوں سے محترمہ قطعاً بے خبر تھیں۔ اس یقین دہانی کے بعد میر مرتضیٰ بھٹو کو فوج نے کئی طرح سے چیک کیا اور ثابت ہو گیا کہ میر مرتضیٰ بھٹو کسی منفی سرگرمی میں ملوث نہیں ہیں۔ ان کی دی گئی یقین دہانی درست ہے۔ محترمہ کے بعد میاں نواز شریف کا دور حکومت آیا اور میاں نواز شریف بھی خاصے شریف ثابت ہوئے اور سازشیوں نے ان سے پے در پے سیاسی غلطیاں کروائیں نتیجتاً 1993ء میں اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس موقع پر میر مرتضیٰ بھٹو نے اعلان کیا کہ وہ سیاست میں حصہ لیں گے۔ اکتوبر 1993ء میں محترمہ بینظیر بھٹو ایک مرتبہ پھر وزیر اعظم نامزد ہوئیں۔ محترمہ نے اگرچہ جنرل عبدالوحید سے مرتضیٰ بھٹو کی واپسی کے لیے بات کی نیز بیگم نصرت بھٹو نے بھی اعلیٰ حکام سے میر مرتضیٰ بھٹو کی واپسی کے لیے بالواسطہ رابطہ کیا لیکن فوجی قیادت کی طرف سے یہ تاثر ملا کہ فوج میر مرتضیٰ بھٹو کی وطن واپسی پر کوئی اعتراض نہیں رکھتی البتہ میر مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ قوانین کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔'' 19 اکتوبر 1993ء میں محترمہ وزیر اعظم بنیں اور 4 نومبر 1993ء کو میر مرتضیٰ بھٹو نے عجلت کی اور پاکستان پہنچ گئے۔ اس کے برعکس محترمہ اپنی سیاسی بصیرت اور صبر و تحمل سے کام لینے کی عادی رہیں ہیں۔ لہٰذا وہ چاہتی تھیں کہ میر مرتضیٰ بھٹو مزید کم از کم 6 ماہ تک وطن واپس نہ آتے کیونکہ دوسری مرتبہ وزیر اعظم بننے کے بعد وہ اس قدر جلد کسی بھی ادارہ کی مرہون منت نہ ہونا چاہتی تھیں۔

قبل اس کے فوج کی طرف سے واضح عندیہ تھا کہ میر مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ قوانین کے مطابق سلوک کیا جائے گا پھر وہی ہوا کہ میر مرتضیٰ بھٹو کو 4 نومبر 1993ء تا 1994ء یعنی

www.bhutto.org

تقریباً 7 ساڑھے 7 ماہ تک جیل میں رہنا پڑا۔ اگر محترمہ بینظیر بھٹو کی سیاسی پالیسیوں کے مطابق میر مرتضیٰ بھٹو مزید 6 ماہ وطن واپس آنے میں تاخیر کر دیتے تو عین ممکن ہے کہ میر مرتضیٰ بھٹو کو 7 ماہ جیل میں نہ رہنا پڑتا۔ یہی وہ مقام تھا کہ جب۔۔۔۔

محترمہ کے متعلق میر مرتضیٰ بھٹو غلط فہمی اور شکوک وشبہات کا شکار ہو گئے۔ اور پھر لگائی بجھائی کرنے والوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور کہا جانے لگا کہ ''بہن وزیراعظم ہو اور بھائی جیل میں ہو کس طرح ممکن ہے؟ تاہم وقت نے ثابت کیا کہ میر مرتضیٰ بھٹو کی وطن واپسی میں عجلت خطرناک ثابت ہوئی۔

محترمہ بینظیر بھٹو اور میر مرتضیٰ بھٹو کے درمیان مخالفت اور شکوک وشبہات پیدا کرنے والے جانتے تھے کہ کسی وقت بھی محترمہ و میر صاحب کے درمیان یہ وقتی رنجشیں ختم ہو سکتی تھیں۔ کیونکہ مخالفین وسازشی ٹولہ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ ''29 اکتوبر 1993ء میں دمشق سے میر مرتضیٰ بھٹو نے بذریعہ ٹیلی فون اپنی والدہ بیگم نصرت بھٹو کو ایک ایسی سازش سے آگاہ کیا کہ جو ''میر مرتضیٰ بھٹو'' کے قتل کرنے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ نیز میر مرتضیٰ بھٹو نے محترمہ بینظیر بھٹو کو بیگم نصرت بھٹو کی وساطت سے پیغام بھجوایا کہ ''بینظیر میرے دشمن دراصل تمہارے دشمن ہیں اور میرے قتل کے بعد تمہارے لیے آسانیاں نہیں بلکہ مشکلات پیدا ہوں گی۔''

اسی طرح 10 جون 1994ء کو بمقام لاڑکانہ جب میر مرتضیٰ بھٹو کی دستار بندی کی گئی تو اس موقع پر میر مرتضیٰ بھٹو نے محترمہ کو پیغام بھجوایا کہ۔

''بینظیر'' تمہارا ہر دکھ میرا دکھ ہے اور تمہارا ہر خواب میرا خواب ہے۔ مگر یاد رکھنا کہ ہمارے خلاف سازشوں کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔'' اور پھر وقت نے ثابت کر دیا کہ میر مرتضیٰ نے سچ کہا تھا۔ جن سازشوں کے سلسلے کی نشاندہی میر نے کی تھی وہ تادمِ تحریر جاری ہیں۔ محترمہ بینظیر بھٹو اپنے مخصوص سیاسی طریق کار اور بدلتے ہوئے عالمی حالات کے پیش نظر ''امریکہ'' کے ساتھ تعلقات میں بہتری لا چکیں تھیں جبکہ میر مرتضیٰ بھٹو کو ابھی مخالفت کا سامنا تھا۔ ''شاید'' یہی وجہ تھی کہ میر مرتضیٰ بھٹو کے متعلق فوج، سول انٹیلی جنس اور پولیس ایڈمنسٹریشن نے مخصوص ومحتاط رویہ اپنائے رکھا اور پھر۔۔۔۔ میر مرتضیٰ بھٹو اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کی طرح ایٹمی ٹیکنالوجی اور دفاعی امور میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میر

www.bhutto.org

مرتضیٰ نے سخت محنت اور جاں فشانی سے ان بین الاقوامی اسمگلروں سے رابطے کیے اور کسی حد تک تعلقات بھی قائم کیے جو ایٹمی ٹیکنالوجی سے متعلقہ معلومات فراہم کرتے تھے۔ نیز وہ اسمگلرز عملی طور پر ایٹمی ٹیکنالوجی کا سامان بھی مہیا کر سکتے تھے۔ اسی بناء پر۔۔۔۔ میر مرتضیٰ بھٹو ایک ایسا منصوبہ رکھتے تھے کہ جس پر عملدرآمد کرنے کے بعد ''سپر کمپیوٹر'' حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اس سے قبل ضیاء الحق کے دور میں سپر کمپیوٹر کے حصول میں مکمل ناکامی ہو چکی تھی۔ بعد ازاں پاکستان کے قابل فخر کمپیوٹر سائنسدانوں نے متبادل انتظامات کیے۔

وہ ممالک جو ایٹمی طاقت بن چکے تھے ان کے متعلق انتہائی خفیہ معلومات میر مرتضیٰ نے حاصل کر رکھی تھیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے وطن واپسی کے کچھ عرصہ بعد کوشش کی کہ کسی طرح ان کی ملاقات پاکستان کے ایٹمی سائنسدانوں سے ہو جائے۔ مگر بوجوہ ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ میر مرتضیٰ بھٹو کو اپنے ملک کی ایٹمی ٹیکنالوجی کی تعمیر و ترقی میں جنونی حد تک دلچسپی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ میر نے اپنے ملک کی ٹیکنالوجی کو مضبوط کرنے کے لیے۔۔۔۔ ''ایٹمی ٹیکنالوجی کے استعمال پر ایک مقالہ لکھا۔'' میر مرتضیٰ بھٹو اس میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن اس مقالہ پر انہیں بوجوہ پی ایچ ڈی کی ڈگری نہ مل سکی۔ ڈگری ملنا نہ ملنا الگ موضوع البتہ ان کا یہ مقالہ ایٹمی ٹیکنالوجی میں ان کی دلچسپی اور رجحان کی مکمل و جامع عکاسی کرتا ہے۔

میر مرتضیٰ نے اپنی سولہ سالہ جلاوطنی میں جہاں مختلف پریشانیوں اور مصیبتوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا وہاں مرتضیٰ بھٹو نے بین الاقوامی سطح بالخصوص اسلامی ممالک سے بہت اچھے اور مضبوط تعلقات بھی قائم کیے تھے۔ مرتضیٰ نے اپنے ملک واپس آنے کے تقریباً 6 ماہ بعد اپنے شہید والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسلامی ممالک کے سربراہوں سے رابطے کیے اور جنوبی ایشیاء میں نیا اسلامی بلاک بنانے کی نہ صرف تجویز دی بلکہ ایک مکمل منصوبہ بندی پیش کی۔ امریکی تاریخ سے ظاہر ہے کہ ایٹمی ٹیکنالوجی اور اسلامی بلاک کی بات کرنے والے کو وہ کسی طور پر پسند نہیں کرتے اب تو خیر وہ ملک کے ملک پسند نہیں کرتے اور سفاک تاریخ رقم کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ ایسی صورت حال میں کیسے ممکن تھا کہ امریکہ میر مرتضیٰ بھٹو کے لیے اچھے جذبات رکھتا؟

محترمہ و میر دونوں کے درمیان اگرچہ شکوک و شبہات پیدا کرنے والے عناصر

www.bhutto.org

کچھ عرصہ تک کامیاب رہے لیکن نومبر 1995ء میں محترمہ نے میر مرتضیٰ بھٹو سے لے کر پارٹی کی تشکیل نو تک اور پھر سے بیگم نصرت بھٹو کو پارٹی کی چیئرپرسن بنانے تک کے معاملات طے کر دیے بس ان کا اعلان باقی تھا کہ محترمہ کے دوسرے دور حکومت کے ختم کرنے کے لیے سازشی ٹولہ متحد و متحرک ہو گیا۔ دریں اثناء 18 ستمبر 1996ء کو کراچی میں کمشنر آفس وسول سیکرٹریٹ میں بم دھماکے ہوئے اسی شام کراچی پولیس اور انٹیلی جنس بیورو نے محترمہ کو رپورٹ ارسال کی جس میں شک ظاہر کیا گیا کہ ''دہشت گردی کی اس واردات میں بھارتی انٹیلی جنس RAW کے دہشت گرد ملوث ہو سکتے ہیں''۔ جو میر مرتضیٰ بھٹو کے قریبی ساتھی علی سنارا کی رہائی کے لیے حکومت کو بلیک میل کر رہے ہیں۔''

19 ستمبر 1996ء کو پولیس میر مرتضیٰ کے ''باڈی گارڈز'' کو گرفتار کرنا چاہتی تھی مگر اس دوران ''محترمہ بے نظیر بھٹو نے بطور وزیر اعظم اس وقت کے وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر کو ۔۔۔۔۔ خاص ہدایت کی کہ ''میر مرتضیٰ بھٹو سمیت کسی بھی رکن اسمبلی کو پولیس تشدد کا نشانہ نہیں بننا چاہیے۔'' واقفان حال و تاریخ کے مطابق اس وقت کے وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر نے وزیر اعظم کی ہدایت پر کس حد تک عمل کیا۔ آج تک سوالیہ نشان ہے؟ کیونکہ بعد کے حالات سے ظاہر ہے کہ کراچی پولیس نے اپنے متوقع منصوبے کو ترک نہ کیا تھا۔ کراچی پولیس نے میر مرتضیٰ پر الزام عائد کیا کہ انہوں نے ۔۔۔۔۔ ''سی اے سنٹر پر حملہ کیا ہے۔ جبکہ شواہد اس الزام کے برعکس ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ایسا کچھ نہ تھا۔ علاوہ یہ کہ میر مرتضیٰ نے 20 ستمبر 1996ء کو پریس کانفرنس میں کراچی پولیس سے کہا کہ ''اگر وہ انہیں گرفتار کرنا چاہتی ہے تو باقاعدہ وارنٹ حاصل کرے۔''

20 ستمبر 1996ء کی رات بھٹو فیملی کے لیے بھیانک و بھاری گزری۔ ''میر مرتضیٰ بھٹو صدیق گوٹھ میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہیں جلسہ کے اختتام پر ۔۔۔۔۔ جلوس کی صورت واپس 70 کلفٹن کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ وقت و حالات کے سفاک تیور بھٹو فیملی کا جوان میر مرتضیٰ بہت اچھے طریقے سے محسوس کر رہا تھا۔ میر مرتضیٰ کو اطلاع ملی تھی کہ کراچی پولیس ان کے ۔۔۔۔ اور ان کے ساتھیوں کے خلاف کوئی بڑا آپریشن کرنے کی تیاری رکھتی ہے۔ بمطابق اطلاع وقت معلوم نہ تھا۔ ورنہ بھٹو فیملی اور بالخصوص میر مرتضیٰ بھٹو سے توقع تھی کہ وہ اپنا دفاعی انتظام یا متبادل راستہ بنا لیتے مگر ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ رات

www.bhutto.org

8 بج کر 40 منٹ کا وقت تھا میر مرتضیٰ نے اپنے قافلے جس میں ان کے چند ساتھی تھے ۔70 کلفٹن کے قریب پہنچے کہ اچانک ان کی نظر پولیس گاڑیوں پر پڑی ۔ جو بے ترتیب حالت میں کھڑی تھیں ۔ میر مرتضیٰ بھٹو مضبوط اعصاب کے مالک شخص اور پھر ایسی صورت حال کا سامنا کرنا تو ان کی مشق مسلسل رہی تھی ۔ وہ خوفزدہ نہیں ہوئے بڑے پرسکون انداز سے اپنی نشست پر براجمان رہے اور پولیس کے اشارہ پر گاڑی روک دی ۔ ان کے باڈی گارڈز نے پوزیشن سنبھالی مگر میر مرتضیٰ نے بلا تاخیر با اعتماد لہجے میں اپنے باڈی گارڈز کو ہدایت کی کہ ''کوئی گولی نہیں چلائے گا ۔''

مرتضیٰ بھٹو نے پولیس افسر سے بات کرنے کا فیصلہ کیا ۔ انہوں نے پولیس افسر کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا ۔ اشارہ دیکھ کر اے ایس پی شاہد حیات آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہے اور گاڑی کے قریب پہنچ کر میر مرتضیٰ سے کہتا ہے کہ ''سر ہم آپ کے باڈی گارڈز کی تلاشی لینا چاہتے ہیں ۔''

ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ان کے پاس غیر قانونی اسلحہ ہے ۔ اس پر میر مرتضیٰ بھٹو اے ایس پی شاہد حیات کو کہتے ہیں کہ ''وہ چند پولیس افسران اور ملازمین کے ساتھ ان کے پیچھے 70 کلفٹن آ جائیں اور تلاشی لے لیں اس طرح سڑک کنارے تلاشی دینا اور لینا نا مناسب ہے ۔'' ابھی بات چیت جاری تھی کہ اچانک فائرنگ شروع ہوگئی ۔ میر مرتضیٰ بھٹو اور ان کے ساتھی زخمی ہو گئے ۔ بعد ازاں دو موقف سامنے آئے پولیس کے مطابق میر مرتضیٰ بھٹو کے باڈی گارڈز نے اے ایس پی شاہد حیات کو اغواء کرنے کی کوشش کی ۔ جس کی بناء پر پولیس کو فائرنگ کرنا پڑی جبکہ میر مرتضیٰ بھٹو کے ساتھیوں کا موقف ہے کہ اس وقت جب میر صاحب اور اے ایس پی کے درمیان مذاکرات ہو رہے تھے کہ پولیس کی طرف سے فائرنگ ہوئی اور نتیجتاً میر مرتضیٰ بھٹو اور ان کے ساتھی زخمی ہو گئے ۔ بعد ازاں اس حادثے میں 8 افراد قتل ہوئے ۔

(۱) میر مرتضیٰ بھٹو (۲) عاشق حسین جتوئی (۳) سجاد حیدر
(۴) یار محمد بلوچ (۵) وجاہت حسین کھوکھر (۶) محمد رحیم
(۷) عبدالستار (۸) محمد بچل جبکہ 4 زخمی ہوئے ۔
(۱) ڈاکٹر مظہر میمن (۲) اسماعیل (۳) ایاز (۴) اصغر

www.bhutto.org

جبکہ پولیس انتظامیہ کے دو افراد زخمی ہوئے۔

اے ایس پی شاہد حیات اور انسپکٹر حق نواز سیال دونوں معمولی زخمی ہوئے۔ اور پھر انسپکٹر حق نواز سیال 29 ستمبر 1996ء کو قتل ہو گئے۔ صرف 9 دنوں کے مختصر عرصہ میں انسپکٹر حق نواز کے قتل میں بہت سے سوالات اور ان کے جوابات پنہاں ہیں۔ محترمہ بینظیر بھٹو کو وزیر اعظم ہاؤس میں میر مرتضیٰ کے قتل کے متعلق اطلاع بذریعہ فون ان کی بھتیجی ''فاطمہ'' نے دی جبکہ محترمہ کو اطلاع ملنے سے پہلے یہ خبر بین الاقوامی سطح پر نشر کی جا چکی تھی۔ محترمہ کالے لباس میں ملبوس کراچی کے میڈ ایسٹ ہسپتال اپنے بھائی کی لاش پر نوحہ کناں و ماتم کناں تھیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو ابدی نیند سو رہے تھے۔ اُن کی بہن محترمہ بینظیر کی آنکھوں سے آنسوؤں کا نہ رکنے والا سیلاب رواں تھا۔ رونے کی وجہ سے ان کی آنکھیں لہو کی مانند سرخ تھیں۔ جذبات غم سے وجود نڈھال اور کپکپی طاری تھی۔ ابھی تو ان کے بھائی ''شہید حریت'' شاہنواز بھٹو کے قتل کا نہ بھولنے والا منظر محترمہ کی آنکھوں میں تھا کہ ایک اور ناگہانی منظر دیکھ رہی تھیں۔

وقت و حالات کی بے رحمی کے ایک عرصہ بعد وہ اپنے بھائی میر مرتضیٰ سے کس طرح اور کس حال میں مل رہی تھیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو کو میر شاہنواز بھٹو کی طرح شہید ذوالفقار علی بھٹو کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ اس کے بعد محترمہ نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ ''میر مرتضیٰ بھٹو کا قتل در اصل ایک بھٹو کے قتل کے بعد دوسرے بھٹو کا قتل ہے۔ یہ ایک سازش ہے جس کا مقصد حکومت کو ختم کرنا اور قتل کے الزام میں ان کے شوہر آصف علی زرداری سمیت ان کو ملوث کرنا ہے۔ یہ سازش وہ لوگ کر رہے ہیں جن کا مقصد صرف اور صرف بھٹو خاندان کا خاتمہ ہے۔''

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ آنے والے چند ہفتوں میں ایسا ہی ہوا۔ 20 ستمبر 1996ء کو میر مرتضیٰ کا قتل ہوا اور 5 نومبر 1996ء کو محترمہ کی حکومت ختم کر دی گئی اور قتل کا الزام محترمہ بینظیر بھٹو کے شوہر آصف علی زرداری پر عائد کر دیا گیا۔ آج بھی ہماری سیاسی تاریخ میں سوال اپنی تمام تر خوفناکی کے ساتھ جواب طلب ہے کہ پاکستان کی وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کے احکامات کو نظر انداز کرنے والے وہ کون لوگ ہیں کہ جنہوں نے میر مرتضیٰ بھٹو کا قتل کر دیا؟

www.bhutto.org

5

''آصف علی زرداری''

''آصف علی زرداری'' حاکم علی زرداری کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ان کے علاوہ ان کی تین بہنیں ہیں۔ان کا نمبر تیسرا ہے۔یعنی ان سے دو بڑی بہنیں اور ایک ان سے چھوٹی ہیں۔نواب شاہ (صوبہ سندھ) ان کا آبائی علاقہ ہے۔کراچی گرائمر سکول سے سینئر کیمرج کیا بعد ازاں کیڈٹ کالج ''پٹارو'' میں گریجویشن کرنے کے لیے داخل ہوئے اپنی محنت اور لگن سے کیڈٹ کالج ''پٹارو'' سے اچھی پوزیشن میں گریجویشن کی۔طالب علمی کے زمانہ میں لمبا سا مفلر گلے میں لٹکائے رکھنا ان کی خاص عادت تھی۔اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے آصف علی زرداری لندن چلے گئے۔چونکہ بزنس (کاروبار) میں دلچسپی رکھتے تھے۔لہٰذا لندن سنٹر آف اکنامک اینڈ پولیٹیکل سٹڈیز سے بزنس ایڈمنسٹریشن کا ڈپلومہ حاصل کیا۔

ڈگری کورس چار سالہ تھا وقت کی کمی کے باعث انہوں نے ایک سالہ ڈپلومہ پر اکتفا کیا۔آصف علی زرداری ''سینٹ پیٹرک'' میں زیر تعلیم رہے۔جہاں روزنامہ جنگ کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر ''شکیل الرحمٰن'' ان کے کلاس فیلو تھے۔لندن میں وہ تقریباً عرصہ ڈیڑھ سے دو سال رہے۔وہاں پر ان کا ذاتی گھر تھا۔جو دو کمروں پر مشتمل تھا۔اس گھر میں اس وقت ''جام صادق علی'' بھی رہائش پذیر رہے۔بعد میں یہ رہائش آصف علی زرداری کے والد نے ''جام صادق علی'' کو کچھ کم قیمت کے عوض فروخت کر دی۔یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ'' آصف علی زرداری چونکہ حاکم علی زرداری کے اکلوتے بیٹے ہیں۔اور پھر روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی لہٰذا ان کے والد گرامی نے فیصلہ کیا کہ آصف علی زرداری لاڈ پیار اور پیسہ کی فراہمی کی وجہ سے بگڑ نہ جائیں۔ان کے بہتر مستقبل اور تعلیم و تربیت کے لیے

www.bhutto.org

آصف علی زرداری

www.bhutto.org

''بورڈنگ'' میں داخلہ کروایا تھا۔ جس ''بورڈنگ'' میں آصف علی زرداری رہے وہاں کی زندگی مختلف تھی۔ انتظامی امور خاصے سخت تھے۔ قواعد وضوابط کا پابند رہنا پڑتا تھا اور ڈسپلن کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ یہی تعلیم وتربیت ان کی بہترین تعلیمی کامیابیوں کی وجہ بنی۔

لندن ایک روایتی مقام ہے۔ سٹوڈنٹ لائف میں وہاں اتنا وقت میسر نہیں آتا کہ غیر نصابی سرگرمیوں میں شمولیت کی جائے۔ البتہ جس ادارہ تعلیم میں آصف علی زرداری طالب علم تھے وہ بین الاقوامی نوعیت رکھتا تھا۔ جس کی وجہ سے مختلف ممالک ایران، ترکی، امریکہ، انڈونیشیا غرض دنیا بھر کے طالب علم وہاں موجود ہوتے تھے۔ وہاں پر ملکی وغیر ملکی طالب علم ان کے دوست بن گئے۔ آصف علی زرداری کو سیاحت کا بہت شوق تھا اور جب بھی انہیں موقع میسر آتا وہ کویت، پیرس، ہیگن اور سویڈن چلے جاتے اور اس طرح وہ اپنے شوق سیاحت کی تکمیل کرتے۔

یورپ کے لیڈنگ ملک میں رہتے ہوئے آصف علی زرداری ''بولڈ'' مزاج نہیں تھے۔ عام انسانوں کی طرح رہتے تھے۔ گھوڑوں سے خاصی دلچسپی رکھتے تھے اور ہر وقت وہ تلاش میں رہتے کہ رائڈنگ کا موقع میسر آجائے۔ طالب علمی کے زمانے میں نہ تو کبھی اپنے ملک میں اور نہ ہی دیار غیر میں انہیں روپے پیسے سے دلچسپی رہی یا احساس رہا۔ کیونکہ ان کے گھرانے کا شمار دولت مند گھرانوں میں ہوتا ہے۔ جب وہ بورڈنگ میں تھے تو ان کے والد گرامی کی پوری انڈسٹری تھی۔ ان کے ذاتی بمبینو، اسکالا اور سینما ہاؤس تھے۔ فلم ایگزی بیوٹر، ڈسٹری بیوٹر اور پروڈیوسر بھی تھے۔ بعد میں انہوں نے سینما ہاؤس وغیرہ بیچ دیے۔

آصف علی زرداری نہ تو حساب کتاب رکھنے کے عادی تھے اور نہ ہی بچت کرنے کے۔ عالم نوجوانی میں فلمیں دیکھا کرتے تھے۔

چارلس اور صوفیہ لارین ان کو پسند تھے۔ انہوں نے اردو اور سندھی کی لاتعداد فلموں کی پروڈکشن بھی کی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد آصف علی زرداری نے اپنی عملی زندگی کا آغاز زمینداری سے کیا۔ ''ڈھورا بھائی جان میر پور'' جہاں ان کی زمینیں تھیں۔ یہ علاقہ ''مین روڈ'' سے تقریباً 35 کلومیٹر دور تھا۔ اگرچہ لندن اور سندھ کے نواحی علاقے میں زندگی یکسر مختلف ہے لیکن آصف علی زرداری نے نہایت استغراق سے عرصہ ''پانچ سال''

www.bhutto.org

اپنے فارم پر کام کیا۔

لندن کی آب وہوا، آزادانہ زندگی و ماحول پر سندھ کے نواحی علاقے پر ایک ''فارم'' پر کام کرنے کو ترجیح دینا خاصا کٹھن و دشوار فیصلہ تھا۔ حالانکہ ان کی ایک آنٹی لندن میں مقیم تھیں۔ انہوں نے آصف علی کو لندن میں کاروبار کی پیشکش کی۔ لیکن آصف علی زرداری نہ مانے۔ ان کی دادی ایرانی تھیں اور ان کے خاندان کا تعلق ایران سے تھا۔ جو ''لندن سیٹل'' تھا۔ لیکن آصف علی زرداری کو اپنی مشکل زندگی میں زیادہ کشش نظر آئی۔

ضیاء الحق دور کے مارشل لاء احکامات سے ان کی زمینوں پر پانی بند کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے کھیتی باڑی میں بہت مشکلات پیدا ہو گئیں۔ ان مشکلات نے آصف علی زرداری کو زمینداری سے بیزار کر دیا۔ اور وہ 1984ء میں کراچی منتقل ہو گئے اور کنسٹرکشن کا کام شروع کر دیا۔ اس کام کو بھی انہوں نے خاصی مہارت سے شروع کیا اور بہت سی کامیابیاں حاصل کیں۔ فارغ اوقات میں سوئمنگ، سکوائش، پولو اور رائیڈنگ ان کے پسندیدہ مشاغل تھے۔ نفسیاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو مذکورہ تمام کھیلوں بالخصوص رائیڈنگ سے انسان کے اندر ایک نیا جوش و ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ رائیڈنگ سے ان کو جنون کی حد تک دلچسپی تھی۔ بچپن میں نواب شاہ سے ان کے لیے ''گھوڑا'' آیا کرتا تھا اور نوکر انہیں گھوڑے پر بٹھا کر چکر لگوایا کرتے تھے۔

فرمانبرداری اور عملی زندگی میں سنجیدگی اور کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے ان کے والدین اور بالخصوص بہنوں کا آصف علی زرداری کی شادی کے لیے اسرار شروع ہو گیا لیکن آصف علی زرداری ہر مرتبہ موضوع کو بدلنے میں کامیاب ہو جاتے۔ بہر حال یہ بات طے تھی کہ وہ والدین کی مرضی سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ ایک دن ان کے والد گرامی ''حاکم علی زرداری'' نے شادی پر زور دیا اور پسند بھی پوچھی تو آصف علی زرداری نے ''محترمہ بینظیر بھٹو'' کا نام لیے بغیر اشارے کنائے سے بتا دیا۔ آصف علی زرداری کی والدہ کی فرسٹ کزن کی شادی ''شہید ذوالفقار علی بھٹو'' کے بڑے بھائی سے ہوئی تھی۔ اس طرح تھوڑی یا زیادہ رشتہ داری بھی نکل آئی اور والدین کی رضامندی و خوشی کی سبیل بھی۔

''بقول محترمہ بینظیر بھٹو'' ایک دن آصف علی زرداری کی والدہ نے کلفٹن کے

www.bhutto.org

لاؤنج میں محترمہ سے کہا کہ آصف علی زرداری سے شادی تمہیں (محترمہ) کو ایک نئی سمت ملے گی۔ جس کے جواب میں ''محترمہ'' نے کہا کہ مجھ سے شادی درحقیقت کسی آدمی کے لیے اعزاز نہیں بلکہ ڈراؤنا خواب ہے۔ میری سیاسی زندگی عام نہیں ہے۔ مجھے یہ سہولت نہیں کہ پانچ سال تک سکون سے الیکشن کا انتظار کروں۔ میری سیاست کا تعلق آزادی سے ہے اور سیاست میرا مقصد حیات ہے۔ ایک آدمی کے اس وقت کیا محسوسات ہوں گے؟ جب اسے معلوم ہوگا کہ اس کی بیوی کی زندگی اس کے گرد نہیں گھومتی۔ آصف علی زرداری کی والدہ نے مجھے یقین دلایا کہ وہ ایک پرعزم اور بھروسہ کرنے والا نوجوان ہے وہ سب سمجھتا ہے کہ اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

محترمہ نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ مجھے سفر کرنا پڑتا ہے اور میں ہمیشہ ''شوہر'' کو ساتھ نہیں لے جا سکتی۔ انہوں نے کہا کہ کاروباری مصروفیات کی وجہ سے آصف بھی ہر وقت ساتھ نہ رہ سکے گا۔ پھر میں نے بھی سنا ہے کہ انہیں پارٹیوں میں جانا پسند ہے اور وہ کافی سوشل ہیں۔ جب کہ میرا پاس جو تھوڑا وقت بچتا ہے میں اپنی چند دوستوں کے ساتھ گزارنا پسند کرتی ہوں۔۔۔۔۔ آصف علی زرداری کی والدہ نے سادگی سے کہا کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں جب شادی ہو جاتی ہے تو آدمی بیوی اور فیملی کے ساتھ وقت گزارنا پسند کرتا ہے۔ محترمہ نے جواب میں اپنے آپ کو یہ کہنے سے روکے رکھا کہ عورت کو نئی سمت کے لیے شادی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ حوصلہ افزائی ہوتے دیکھ کر محترمہ نے گہرا سانس لیا، اور بات کا رُخ سب سے مشکل موضوع کی طرف موڑ دیا کہ روایت کے مطابق سسرال کے ساتھ رہنا پڑتا ہے لیکن بوجوہ میں سسرال والوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ گھر میں دن رات پارٹی اور دیگر سیاسی نوعیت کے اجلاس ہوتے رہتے ہیں۔ سیاسی کارکن ہمہ وقت موجود رہتے ہیں اس لیے مجھے اپنے گھر کی ضرورت ہوگی۔

آصف علی کی والدہ نے ناقابل یقین انداز میں کہا کہ ''مجھے قبول ہے'' اور آصف علی کو بھی اعتراض نہیں ہوگا اور نہیں بھی ان مصروفیات سے الگ رہنا پسند کریں گی۔۔۔۔ بالآخر دسمبر 1987ء کو آصف علی زرداری کی شادی محترمہ سے طے پا گئی۔

قبل ازیں آصف علی زرداری نے ''محترمہ بینظیر بھٹو'' کو بچپن میں انگریزی فلم ''ژوا گویا مائکے'' کے پریمیئر شو پر دیکھا تھا۔ یہ 1960ء کے اواخر کی بات ہے۔ بعد ازاں

www.bhutto.org

1980ء کے شروع میں شادی کے متعلق بات چیت کا آغاز ہوا تو اس کے پانچ سال بعد 1984,85 میں کراچی میں محترمہ سے ایک ڈنر پر ملاقات ہوئی۔ پھر ان کی آنٹی نے لندن بلایا اور کہا کہ ''محترمہ'' تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ ان دنوں آصف علی زرداری کا گھوڑا پولو گراؤنڈ میں دوران کھیل دوسرے کھلاڑی کے گھوڑے سے ٹکرا گیا۔ اس ''ایکسیڈنٹ'' سے ان کی ٹانگ میں شدید فریکچر ہو گیا۔ وہ جلد صحت یاب نہ ہو سکے اور تقریباً دو ماہ بعد خاصی ایکسرسائز اور علاج سے وہ لندن جانے کے قابل ہوئے۔

تاہم اس ملاقات سے آصف علی زرداری اور محترمہ کے درمیان سیاسی عزم و امور اور آئندہ لائحہ عمل زیر بحث رہے اور اس کے بعد منگنی ہو گئی اور باقاعدہ اعلان کیا گیا۔ شادی طے ہونے پر محترمہ نے آصف علی زرداری کو ایک پن کا تحفہ دیا اور آصف علی زرداری نے سفائر اور ڈائمنڈ (ہیرے) کی انگوٹھی محترمہ کو دی۔

(شادی کی چند جھلکیاں اور تبصرے)

☆ دسمبر 1987ء میں جب شادی ہوئی تو ایک کارکن نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ '' میں آج کیوں نہ آتا یہ عوام کی شہزادی کی شادی اور ان کے مجازی خدا کی شخصیت کیسی ہے؟ کہ جس کا اثر پاکستان پیپلز پارٹی کا سیاسی مستقبل مشروط ہو گئے ہیں۔''

☆ ہانگ کانگ کے ایک ''انگریزی جریدے'' اپنی رپورٹ میں کہا کہ ''بینظیر بھٹو'' اپنی شادی کے موقع پر اپوزیشن کی بنیادی علامت نہیں تھیں۔ بلکہ ایک مسرور دلہن تھیں۔ ان کے شوہر (آصف علی زرداری) کی شخصیت ڈیشنگ (بہت پر اثر) تھی۔ اگرچہ اس رات دلہا (آصف علی) کچھ بے اطمینانی محسوس کر رہے تھے۔ اس تقریب میں پچاس ہزار افراد نے شرکت کی۔ رپورٹ میں مزید لکھا کہ ''اگرچہ دولہا دلہن (آصف و محترمہ) دونوں کی عمر 34,34 برس ہے۔ محترمہ سیاسی عزم رکھتی ہیں جبکہ زرداری صاحب دولت مند تاجر اور پولو کے شوقین ہیں۔ جریدے نے یہ بھی لکھا ہے کہ آصف علی زرداری محترمہ کی زندگی کا خلا پر کر دیں گے۔ اور آصف علی زرداری کا کہنا ہے کہ وہ گھریلو زندگی میں ان کا ساتھی بنیں گے تاکہ وہ سیاست میں پرسکون انداز سے کام کر سکیں۔

www.bhutto.org

www.bhutto.org

☆ آصف علی زرداری کی دعوت ولیمہ میں مرحوم خان عبدالولی خان نے بطور خاص شرکت کی۔ عوامی نیشنل پارٹی کی رہنما بیگم نسیم ولی خان اپنی علالت کی وجہ سے نہ پہنچ پائیں۔ خان عبدالولی خان نے اے این پی (عوامی نیشنل پارٹی) کے رہنما کی حیثیت سے شادی میں شرکت حاکم علی زرداری کی وجہ سے تھی۔ کیونکہ حاکم علی زرداری عوامی نیشنل پارٹی کے مرکزی نائب صدر تھے۔

☆ غلام مصطفیٰ کھر سابق گورنر اور وزیر اعلیٰ نے کہا کہ "سیاسی اختلافات سے قطع نظر بےنظیر میری بیٹی کی طرح ہیں اور ان کی شادی ایک اچھے گھرانے میں ہوئی ہے۔" ان کی شادی ایک اچھی خبر ہے۔"

☆ ایک امریکی جریدے نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "پاکستان پیپلز پارٹی کی شریک چیئر پرسن محترمہ بینظیر بھٹو گزشتہ ڈیڑھ برس سے پاکستان کی گلیوں میں سیاست اور انتخابات کے لیے جدوجہد کر رہی تھیں اب انہوں نے گزشتہ ہفتے مالدار خاندان کے صاحبزادے آصف علی زرداری کے ساتھ پھولوں کے سائے میں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئیں ہیں۔ اس موقع پر دو استقبالیہ دیے گئے ایک خالصتاً عوامی تھا جس میں پچاس ہزار سے زائد حامیوں نے شرکت کی۔ جریدے کے مطابق بینظیر بھٹو کہتی ہیں کہ وہ ایک خاندان چاہتی تھیں۔ جو بالآخر انہیں مل گیا۔"

☆ واشنگٹن۔ ایک غیر ملکی جریدے نے لکھا ہے کہ بےنظیر بھٹو کی قریبی سہیلی شریں باجوہ کے مطابق "بینظیر بھٹو" کو آصف علی زرداری کی طرح کا خاوند چاہیے تھا جو اسے مل گیا اور وہ احساس تحفظ محسوس کر رہی ہیں۔"

☆ اس تقریب میں شادی کے لیے 14 غیر ملکی ٹیلی ویژن ٹیموں نے فلم بندی کی۔ غیر ملکی مہمانوں کی تعداد سات سو (700) کے قریب تھی تاہم کسی غیر ملکی سربراہ کو دعوت نہیں دی گئی تھی۔ مذکورہ ٹیلی ویژن ٹیموں میں امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا اور یورپین ممالک شامل تھے۔

☆ قومی سیاستدانوں و رہنماؤں کی ایک کثیر تعداد آصف علی زرداری کی شادی میں بطور خاص شرکت کی جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

قومی محاذ آزادی کے سیکرٹری جنرل اقبال حیدر اور ان کی اہلیہ۔ ایم آر ڈی کے

www.bhutto.org

نیپ پختونخواہ عبدالرحیم مندوخیل ولالہ عبدالرحمٰن۔ نیشنل پارٹی کے چیئرمین غلام مصطفیٰ جتوئی ان کے بھائیوں سمیت صاحبزادوں نے شرکت کی، قومی اسمبلی کے ارکان میں سے ائیر مارشل ریٹائرڈ نور محمد خان اور آفاق شاہد۔ صوبائی اسمبلی کے اراکین میں سے لیاقت جتوئی اور ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو کے بھائی مسعود کھوڑو شریک ہوئے۔ نکاح کی تقریب میں مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ ان کے صاحبزادوں مخدوم امین فہیم، مخدوم خلیق الزمان، مخدوم رفیق الزمان اور مشتاق بھٹو، مجید خانزادہ، فیصل صالح حیات، جہانگیر بدر، صوبائی سیکرٹری منظور آفندی بھی شریک ہوئے۔ علاوہ ازیں ممتاز بھٹو کے بھائی عاشق بھٹو اور معشوق بھٹو بھی شریک ہوئے۔

ہمارے ملک کے نامور صحافی، ادیب و دانشور جن کے متعلق صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ میرے بزرگ ہیں اور الفاظ ان کے قلم کے محتاج "ارشاد احمد حقانی" انہوں نے آصف علی زرداری اور محترمہ کی شادی کے فوراً بعد ایک مضمون اپنے خاص اسلوب کے ساتھ لکھا۔ جو روزنامہ جنگ میں شائع ہوا۔ محترمہ کی شادی اور آصف علی زرداری کی شخصیت نیز آنے والے دنوں میں پیپلز پارٹی کے مستقبل کے بارے میں" آج بھی ان کا مضمون تاریخی حوالہ وسند ہے۔" جو شکریہ کے ساتھ قارئین کی نظر کر رہا ہوں۔

(یاد رہے کہ یہ مضمون ارشاد احمد حقانی صاحب کا 27 دسمبر 1987ء میں شائع ہوا)۔

"پاکستان پیپلز پارٹی کی شریک چیئرپرسن بینظیر بھٹو کی شادی ایک پرائیویٹ شہری کا محض ایک نجی معاملہ ہوتی تو اس پر کسی تبصرے کا جواز نہ ہوتا لیکن مس بھٹو کو سیاسی مقام نے اس خالص نجی مسئلہ کو ایک اہم سیاسی واقعہ بھی بنا دیا۔ ملکی اور غیر ملکی پریس نے اس میں گہری دلچسپی لی اور اس کی ایک ایک تفصیل عوامی بحث و گفتگو کا موضوع بن گئی۔ مس بھٹو کی شادی بعض حلقوں کے مطابق اس صدی کی اہم ترین شادی ہو یا محض اس عشرہ کی، یہ حقیقت ہے کہ عوامی سطح پر جس قدر دلچسپی اور جذباتی وابستگی اس تقریب کے موقع پر دیکھنے میں آئی، اس نے اس واقعہ کو واقعی بینظیر بنا دیا۔

کراچی شہر میں بالعموم اور اس کے دو مختلف علاقوں کلفٹن اور لیاری میں بالخصوص کئی روز تک جشن اور میلے کا سماں رہا۔ ککری گراؤنڈ میں سٹیج کی تیاری کے تمام مراحل میں

www.bhutto.org

ہزاروں افراد روزانہ اس جگہ پر موجود رہے۔ بہت سوں نے ذاتی طور پر تعمیراتی کام میں شرکت کی اور بالکل اس طرح اس میں منہمک رہے جیسے وہ کسی عمیق جذباتی تعلق اور رشتہ کی وجہ سے ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔ 10 اپریل 1986ء کے بعد پی پی پی کی سیاسی کارکردگی کیسی رہی ہے اور حالیہ بلدیاتی انتخابات میں اس کا ریکارڈ کس معیار کا ہے۔ اس پر ایک سے زیادہ آراء ہو سکتی ہیں لیکن اس حقیقت میں کوئی کلام نہیں کہ بینظیر بھٹو ذاتی مقبولیت کے ایسے مقام پر فائز ہیں جس میں پاکستان کا کوئی دوسرا سیاسی رہنما ان کا حریف ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس کے شواہد اور مظاہر تو ہمیشہ دیکھنے میں آتے رہتے ہیں لیکن 18 دسمبر کو کلفٹن کے گرد و نواح میں اور ککری گراؤنڈ کے طول و عرض میں بے نظیر کی والہانہ وابستگی اور شیفتگی کے جو مناظر دیکھنے میں آئے وہ واقعی بے مثال تھے۔

میں نے ککری گراؤنڈ کی سٹیج کے ایک کونے میں دھڑا دھڑ نوٹس لیتی ہوئی ایک نوجوان انگریز خاتون صحافی سے جب پوچھا کہ اس نے شہزادہ چارلس اور لیڈی ڈیانا کی شادی دیکھی تھی اور وہ دونوں شادیوں کا کیسے تقابل کرے گی۔ تو اس نے کہا کہ میں نے برطانوی شاہی جوڑے کی شادی بھی دیکھی تھی۔ لیکن جو جذباتی وابستگی اور شیفتگی مجھے اس عظیم مجمع میں نظر آ رہی ہے، اس کا عشر عشیر بھی پرنس آف ویلز کی شادی میں دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ میں جب ان کوسٹرز میں سے ایک میں جو غیر ملکی اور پاکستانی صحافیوں کے لیے فراہم کیے گئے تھے، کلفٹن گارڈن کے استقبالیہ سے ککری گراؤنڈ کے لیے روانہ ہوا تو مجھے ''عوامی استقبالیہ'' کے تیوروں کا اندازہ بالکل شروع ہی میں ہو گیا تھا۔

کلفٹن سے ''دو تلواروں'' اور ''تین تلواروں'' والے چوکوں تک ان سے آگے میلے کا سا سماں تھا اور چراغاں کی وجہ سے پورا علاقہ جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ جگہ جگہ مختلف افراد اور تنظیموں کی طرف سے آویزاں ''شادی مبارک'' کے بینر نظر آ رہے تھے۔ ککری گراؤنڈ کے چاروں طرف سجاوٹ اور آرائش کے مناظر خاصی دور ہی سے شروع ہو گئے تھے۔ یہاں شائقین کا اس قدر اژدھام تھا کہ گاڑیوں کے لیے چلنا مشکل ہو گیا تھا۔ ان میں زیادہ تر نوجوان تھے۔ جن کے لباس اور وضع قطع صاف ظاہر کر رہے تھے کہ ان کا تعلق غریب اور محروم اور نچلے متوسط طبقے سے تھا۔ ان میں ہر لسانی اور نسلی گروہ کے لوگ تھے جن کی اکثریت نے سینوں پر شادی کی مناسبت سے مختلف بیجز سجا رکھے تھے۔ پی پی پی سیاسی

www.bhutto.org

لحاظ سے کبھی کامیاب ہو گی بھی یا نہیں اور ہو بھی گئی تو ان لوگوں کو (یا ملک کے وسیع محروم طبقات کو) کچھ دے سکے گی یا نہیں، یہ تو میں نہیں جانتا یا نہیں کہہ سکتا لیکن اس کی قائد اور بھٹو کی یاد سے ان لوگوں کی یاد اور محبت کی وابستگی میں ہرگز کوئی کلام نہیں۔ بینظیر بھی ان محروم اور بھٹو خاندان کا ایک رومانوی تصور رکھنے والے لوگوں سے اپنی وابستگی کا اظہار کرنے میں کبھی پیچھے نہیں رہیں اور ہمیشہ یہی کہتی ہیں کہ اپنی جدوجہد اور مشکلات میں جو چیز انہیں سہارا اور بے پناہ مصائب کے باوجود اپنی راہ سے نہ ہٹنے کا حوصلہ دیتی ہے، وہ غریب عوام سے ان کا باہمی رشتہ ہی ہے۔

ککری گراؤنڈ کے طول و عرض میں دیوانہ وار ''جئے بھٹو''، سدا جئے کا نعرے لگانے والے انسانوں کے وسیع ہجوم پر ایک نظر ڈالتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اگر بینظیر کو کبھی اقتدار مل گیا اور اس نے معاشرہ کے کمزور اور پسماندہ طبقات کے لیے کچھ نہ کیا تو یہ اتنی بڑی بے وفائی ہو گی، جس کی مذمت کے لیے کوئی بھی لفظ سخت نہیں ہو گا۔ ویسے میں نے ملکی صورتحال اور بینظیر کی سوچ کو جس قدر سمجھا ہے اس کے پیش نظر میں اس حوالہ سے تو یقیناً شک و شبہات رکھتا ہوں کہ بے نظیر اقتدار پر جلد قابض ہو سکے گی۔ لیکن اس حقیقت میں مجھے کوئی شبہ نہیں کہ بینظیر کو جب بھی اختیار اور اقتدار ملا، وہ غریب عوام کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کرے گی۔ اس کا محروم عوام سے رشتہ حقیقی اور سچا ہے۔ پاکستان میں سابق برطانوی سفیر نے لاہور میں ایک ذاتی ملاقات میں مجھ سے بے نظیر کی شخصیت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے سوال کیا تھا کہ کیا تمہاری رائے میں محروم طبقات کی بہبود کے مقصد سے اس کی وابستگی حقیقی اور مخلصانہ ہے؟ میں نے برطانوی مدبر کو بھی (بینظیر کی وطن واپسی کے کوئی تین ماہ بعد جب 14 اگست 1986ء کے واقعات ابھی ظہور پذیر نہیں ہوئے تھے) یہی جواب دیا تھا کہ بینظیر کی غریب عوام سے مخلصانہ وابستگی میں تو مجھے کوئی شبہ نہیں آیا وہ جلد اقتدار پر بھی آ سکے گی، اس کے بارے میں میں اعتماد سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

مجھے پی پی پی کے قائد سے دو چار تفصیلی ملاقاتیں کرنے کا موقع ملا ہے اور میرا یہ واضح تاثر ہے کہ اس کے عوام دوستی کے نعرے اور دعوے بناوٹی اور منفقانہ نہیں، حقیقی اور مخلصانہ ہیں۔ اس کے دل میں اس بات کی بڑی حقیقی قدر ہے کہ مصائب کی طویل رات میں یہ غریب عوام ہی تھے، جنہوں نے اسے محبت، حوصلہ اور سہارا دیا ہے۔ ایک دفعہ جب

www.bhutto.org

میرے ساتھ ایک انٹرویو کے دوران وہ اپنے مرحوم بھائی شاہنواز بھٹو کے جنازے کے وقت عوام کی والہانہ محبت اور وابستگی کا تذکرہ کر رہی تھیں تو ان کی آواز بھرا گئی، ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی اور شعوری کوشش سے انہوں نے اپنی اس کیفیت پر قابو حاصل کیا جس کے دوران چند لمحوں کے لیے مجھے انٹرویو روک دینا پڑا۔ بینظیر نے لکڑی گراؤنڈ کے استقبالیہ کے اختتام پر بھی جب اپنی مختصر لیکن پر جوش تقریر میں یہ اعلان کیا کہ وہ اپنی شادی کے باوجود عوام سے اپنا رشتہ نہیں توڑیں گی تو ان کی آواز میں اخلاص کا رنگ اور آہنگ نمایاں تھا۔

اسی طرح جب انہوں نے کہا کہ آج کے دن انہیں اپنے باپ اور بھائی بہت یاد آئے لیکن ہزاروں لاکھوں بھائیوں اور بہنوں کی محبت نے انہیں حوصلہ اور سہارا دیا ہے، تو یہ بات ان کے دل سے نکلی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ بینظیر بھٹو کے سیاسی شعور کی سطح وقت کے ساتھ ساتھ بلند ہو رہی ہے تجربات اور واقعات انہیں بہت کچھ سکھا رہے ہیں اور ابھی انہیں بہت کچھ سیکھنا ہے لیکن اپنے کاز اور مشن کا جو بھی تصور وہ رکھتی ہیں، اس سے ان کی وابستگی کے مخلصانہ ہونے میں مجھے ذرا برابر بھی شبہ نہیں۔ وہ صرف اقتدار کے سنگھاسن پر براجمان ہونے کے لیے عوام دوستی کا نعرہ نہیں لگا رہیں، وہ اقتدار کو عوام کی خدمت کا ذریعہ بنانے کا حقیقی عزم بھی رکھتی ہیں لیکن بے رحم حقائق کی اس دنیا میں محض اخلاص اور نیک خواہشات ہی سب کچھ نہیں ہوتے، دوسرے بہت سے عوامل بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

بینظیر بھٹو کی جدوجہد میں کامیابی کے لیے درکار تمام مثبت اور منفی عوامل کبھی یکجا اور فراہم ہو سکیں گے اس کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی مگر مجھے یہ کہنا غلط معلوم نہیں ہوتا کہ لکڑی گراؤنڈ میں جن لاتعداد اور ان گنت لوگوں نے بینظیر بھٹو سے بے پناہ تعلق خاطر اور محبت کا اظہار کیا، ان کی محبت بے محل نہیں تھی۔ لیکن ان کی پسندیدہ قائد ان کے لیے عملاً بھی کچھ کر سکنے کے قابل ہو سکے گی، یہ پردۂ غیب میں مخفی امکانات کی باتیں ہیں جن کے بارے میں دعوے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

بینظیر کی شادی کو جو بے پناہ پبلسٹی ملی ہے اس کی وجہ سے اور بعض دوسرے عوامل کے سبب یہ تاثر بھی ایک حلقہ میں پیدا ہوا ہے کہ غریبوں کی حامی ہونے کی مدعی ایک لیڈر نے اپنی شادی بڑی دھوم دھام سے کی ہے، اس پر اسراف کا مظاہرہ کیا گیا۔ بے پناہ دولت

www.bhutto.org

خرچ کی گئی ہے، جس سے عوام دوستی اور غریب دوستی کے دعوؤں کی قلعی کھل جاتی ہے۔ ایک لیڈر نے طنزیہ کہا ہے" یہ ایک سوشلسٹ لیڈر کی شادی تھی"۔ بعض حلقوں نے شادی پر دو کروڑ خرچ ہونے کا ذکر کیا ہے۔ میری دانست میں یہ تنقید بہت حد تک بے جواز ہے۔ بینظیر کی شادی کی تقریبات میں سے ککری گراؤنڈ کا استقبالیہ نکال دیا جائے تو بھٹو خاندان کے سماجی اور مادی مقام حوالہ سے یہ ایک سادہ اور کم خرچ شادی تھی۔

70 کلفٹن کا استقبالیہ ہرگز پرشکوہ یا اسراف کا آئینہ دار نہ تھا۔ یہاں جو کھانا دیا گیا وہ واقعی بہت سادہ اور اوسط درجے کا تھا (میں تعریف کے انداز میں اس کی سادگی بیان کا ذکر کر رہا ہوں) یہاں صرف ایک سویٹ ڈش تھی، کوئی پھل نہیں تھا۔ ایک سالن چینی طرز کی ابلی ہوئی سبزی گوشت پر مشتمل تھا اور ان لوگوں کے لیے تھا جو سرخ مرچ استعمال نہیں کرتے ایک سالن پاکستانی طرز کا تھا، اس کے ساتھ چاول تھے اور بس۔ ظاہر ہے کہ اس کھانے کو سادہ تو کہا جا سکتا ہے، مصرفانہ نہیں۔ بینظیر نے "بری" میں صرف دو تین جوڑے کپڑے اور معمولی زیور قبول کیا۔ خود کوئی جہیز نہیں لیا۔ ان کی بانہوں میں سونے کی ایک بھی چوڑی یا کنگن نہیں تھا۔ کانچ کی سہ رنگ چوڑیاں تھیں۔ اس زمانے میں کانچ کی چوڑیاں شادی پر کون سا خوشحال خاندان اپنی دلہن کو پہناتا ہے؟ یہ درست ہے کہ بینظیر چند تولے سونا پہن بھی لیتیں تو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ اسی طرح وہ جوڑوں کی محتاج تھیں۔ نہ زرداری خاندان ان کے جہیز کا منتظر تھا۔ دونوں صاحب ثروت خاندان ہیں لیکن بینظیر کے فیصلوں کی علامتی اور نظریاتی اہمیت ہے۔

میں نے بینظیر کے بہت قریبی پی پی پی کے ایک سینئر عہدیدار کو کریدنے کے لیے کلفٹن گارڈن کے استقبالیہ میں کہا کہ لوگ شادی پر بے تحاشا دولت خرچ کرنے پر تنقید کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جہیز کی رسم کو نظر انداز کرنے، معمولی حق مہر مقرر کرنے، بری سے مستغنی ہونے اور کانچ کی چوڑیاں پہننے کو اگر آپ مسرفانی سمجھتے ہیں تو آپ کی مرضی۔ "ہم تو سمجھتے ہیں کہ یہ شادی اور غریب اور نچلے متوسط طبقات کی لڑکیوں کو حوصلہ دے گی کہ جہیز اور بے تحاشا سونے کے بغیر بھی شادی ہو سکتی ہے۔"

جہاں تک ککری گراؤنڈ کے استقبالیہ کا تعلق ہے اس پر ضرور خرچ ہوا ہے۔ آتش بازی بھی چھوڑی گئی ہے۔ لیکن یہ تقریب فی الحقیقت ایک سیاسی ضرورت تھی۔ ملک بھر میں

www.bhutto.org

پی پی پی کے ہزاروں کارکن جو بینظیر سے جذباتی وابستگی رکھتے ہیں، خوشی کے اس اجتماع میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ تیس چالیس ہزار کارکنوں کے لیے کوئی ایسی ہی تدبیر اختیار کی جاسکتی تھی جیسی ککری گراؤنڈ کے استقبالیہ کے انعقاد کی صورت میں کی گئی۔ یہ پی پی پی کی سیاسی طاقت کا ایک مظاہرہ اور بینظیر کی مقبولیت کے اظہار کا ایک اندازہ بھی تھا۔ اس تقریب پر خرچ ہونے والی رقم کو سیاسی سرمایہ کاری سمجھا جانا چاہیے۔ لیکن اس ضمن میں ظاہر کیے جانے والے اندازے بھی بہت مبالغہ آراء ہیں اور اس تقریب میں اعتراض کی کوئی جائز وجہ نظر نہیں آتی۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ بینظیر نے اپنے آپ کو واقعی ''ڈی کلاس'' کرلیا ہے یعنی اپنے سماجی اور معاشرتی طبقہ سے ناطہ توڑ لیا ہے۔ وہ پہلے ایک جاگیردار خاندان کی صرف بیٹی تھیں، اب وہ ایک بڑے زمیندار اور سرمایہ دار خاندان کی بہو بن گئی ہیں۔ ان کے پاس دولت کی ریل پیل پہلے جس قدر تھی، اب اس سے بھی زیادہ ہوگی۔ لیکن یہ چیز انہیں سیاسی کردار ادا کرنے یا سماجی و معاشی انصاف کی علمبرداری کا دعویٰ کرنے کا نااہل قرار نہیں دیتی۔ ہاں یہ شرط ہے کہ وہ بہت مسرفانہ زندگی نہ گزاریں اور نہ دولت کی نمود و نمائش کریں۔ انہوں نے ہنی مون منانے کے لیے سوئزرلینڈ یا کسی بھی دوسری جگہ نہ جانے کا فیصلہ کر کے بھی اپنی ہوشمندی کا مظاہرہ کیا ہے۔

حالانکہ اگر وہ چار ہفتے کے لیے باہر چلی بھی جاتیں تو شاید اس پر اعتراض کا کوئی جواز نہ ہوتا لیکن ان کی سیاست سے کمٹمنٹ اس قدر شدید اور مکمل ہے کہ اس کے تقاضے ان کے تمام فیصلوں پر حاوی رہتے ہیں۔ شادی سے متعلق بعض رسوم بھی انہوں نے ادا ضرور کیں لیکن ان میں کوئی قابل ذکر انہماک یا دلچسپی نہیں تھی۔ بلکہ اپنے مشاہدہ کی بناء پر میں یہ کہنے کی طرف مائل ہوں کہ انہوں نے ''دلہنا پا'' ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے اوپر طاری نہیں ہونے دیا۔ عین شادی کے دوران وہ پریس کانفرنسیں کرتی رہیں۔ کلفٹن کے استقبالیہ اور ککری گراؤنڈ کی تقریب میں ہڑبونگ یا ہلڑبازی کے خاتمہ کے لیے فوراً خود متحرک ہو جاتی رہیں۔

ککری گراؤنڈ کی سٹیج پر کئی دفعہ وہ اس طرح مصروف عمل رہیں جیسے آج بھی وہ دلہن نہ ہوں، محض ایک سیاسی لیڈر ہوں۔ ان کی تقریر بھی ان کے معمول کے سٹائل کی آئینہ

www.bhutto.org

دار تھی۔ بظاہر یہ معمولی باتیں ہیں لیکن ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بینظیر کے اندر جو ایک بیقرار سیاسی کارکن چھپا ہوا ہے، وہ اس قدر موثر اور غالب ہے کہ اس نے انہیں زندگی میں صرف ایک دفعہ آنے والے دن میں چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ بیگم نصرت بھٹو نے اپنی بیٹی کی شادی کی کامیابی کے امکانات کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں بالکل درست کہا ہے کہ کسی بھی شادی کی کامیابی کی قطعی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔ ''لیکن بینظیر کے شوہر مسٹر آصف علی ہمدرد، باشعور اور پختہ ذہن کے مالک ہیں اور انہیں توقع ہے کہ دونوں کے درمیان خوشگوار تعلقات رہیں گے۔'' بینظیر کے سیاسی مزاج اور مصروفیات، ان کی شہرت اور مقبولیت اور مسٹر آصف علی کے غیر سیاسی مزاج اور طرز فکر کے حوالہ سے بعض حلقوں میں یہ جائزہ لیا گیا کہ ان میاں بیوی کا نباہ کیسے ہوگا؟

اس حوالہ سے بعض شبہات یا خدشات پیدا ہونا فطری ہے۔ اس لیے کہ یہاں غیر یقینی کیفیت پیدا کرنے والے معمول کے عوامل کے علاوہ بھی بہت سے اضافی اسباب ایسے پائے جاتے ہیں کہ جن کا نتیجہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن میری دانست میں اس رشتہ کے کامیاب رہنے کے امکانات بھی خاصے روشن ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مسٹر آصف علی زرداری نے صورتحال کو سمجھ کر قبول کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اور وہ نئے رشتے پر نہ صرف مطمئن ہیں بلکہ اس پر نازاں ہیں۔ انہوں نے واضح لفظوں میں کہا ہے کہ وہ بینظیر کی سیاست میں مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ لیکن شخصی اور خاندانی سطح پر انہیں پورا تحفظ اور مکمل تعاون دیں گے، حتی کہ جب اخبار نویسوں کے ایک پینل نے ان سے سب سے چبھتا ہوا سوال کیا تو انہوں نے اس کا بھی معقول جواب خندہ پیشانی سے دیا۔

ان سے کہا گیا کہ ''اگر لوگ آپ کو مسٹر بے نظیر بھٹو کہنا شروع کردیں تو آپ کا کیا ردعمل ہوگا۔'' اس سوال پر جوش پر آنے یا بھڑکنے اور اپنی ''قوامیت'' کا مظاہرہ اور دعوی کرنے کی بجائے انہوں نے بڑے سکون سے جواب دیا کہ اس قسم کے تبصروں اور ریمارکس سے میں کوئی اثر قبول نہیں کرتا اور دوسرا جو دل میں آئے، کہے، میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ جواب کوئی ایسا مرد دے سکتا ہے جو انتہائی خود اعتماد اور حقیقت شناس ہو اور جس کے اندر حقائق کو سمجھنے اور خوش دلی سے قبول کرنے کی جرأت اور استعداد ہو۔

ادھر بینظیر بھٹو بھی اگرچہ شروع سے کہہ رہی ہیں کہ ان کی سیاسی شخصیت شادی

www.bhutto.org

سے متاثر نہیں ہوگی اور ان کے شوہر ان کے سیاسی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔ لیکن انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ ایک مثالی بیوی بننے کی پوری کوشش کریں گی، اور اپنے خاوند اور سسرال کو پوری عزت دیں گی اور ان کا پورا احترام کریں گی۔ اس کا ایک ہلکا سا مظاہرہ انہوں نے لکڑی گراؤنڈ کے استقبالیہ میں ہی کر دیا تھا۔ وہ جب ڈولی نما پردہ کے پیچھے سے نمودار ہوئیں اور سٹیج کا چکر لگا کر حاضرین کی تالیوں کا جواب دے چکیں، تو دولہا دلہن کے لیے مخصوص کرسیوں کی طرف بڑھیں پہلے وہ غیر شعوری طور پر اور بے خیالی میں دائیں ہاتھ کی کرسی پر بیٹھ گئیں لیکن فوراً ہی اس سے اٹھیں اسے آصف کے لیے خالی کر دیا اور خود بائیں ہاتھ کی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ یہ گویا ان کی طرف سے اس بات کا علامتی اعتراف تھا کہ وہ اپنے میاں کی اولیت کو تسلیم کرتی ہیں۔

اس رویہ کی موجودگی میں یہ توقع کرنے کا امکان اور جواز بڑھ جاتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان پائے جانے والے سیاسی مرتبہ کے واضح فرق کے باوجود گھر کی سطح پر وہ ایسی مساوات قائم کر سکیں گے جو دونوں کے لیے قابل قبول اور وجہ اطمینان ہوگی۔ بعض حلقوں میں شادی کے بعد بینظیر بھٹو کی مقبولیت میں کمی آنے اور ان کے سیاسی لحاظ سے نسبتاً غیر فعال ہو جانے کا تذکرہ ہوا ہے۔ مجھے یہ دونوں باتیں یکسر بے وزن لگتی ہیں۔ نوجوان اور جذباتی کارکنوں کے ایک حلقہ میں وقتی طور پر جوش و خروش میں قدرے کمی آ سکتی ہے اس لیے کہ یہ نوجوان کارکن بینظیر کی شخصیت کا ایک رومانوی اور طلسماتی تصور رکھتے تھے۔ وہ انہیں گوشت پوست کا انسان نہیں بلکہ کوئی فوق الفطری مخلوق گردانتے تھے۔

شادی کے بندھن میں ان کے بندھ جانے سے یہ طلسم وقتی طور پر ٹوٹ سکتا ہے لیکن یہ عارضی کیفیت ہوگی اور بہت جلد یہ نوجوان کارکن بھی حقیقت کو تسلیم کر لیں گے اور انہیں احساس ہو جائے گا کہ جو کچھ ہوا ہے یہ فطری بھی تھا اور ضروری بھی۔ لہٰذا پارٹی کارکنوں کے اندر مقبولیت کے گراف میں کمی آنے کا اندیشہ بے بنیاد ہے۔ اسی طرح ان کے سیاسی لحاظ سے غیر متحرک اور غیر فعال ہونے کا خدشہ بھی سراسر بے وزن ہے۔ بینظیر بعض عائلی ذمے داریوں کی وجہ سے کسی خاص وقت پر کچھ عرصہ کے لیے غیر متحرک ہو سکتی ہیں۔ ایسا ہونا ناگریز ہے۔ لیکن یہ بھی ایک عارضی کیفیت ہوگی اور پوری تندہی اور انہماک سے پھر اپنے اصل کام کی طرف لوٹ آئیں گی۔

www.bhutto.org

سیاست سے ان کی کمٹمنٹ کی شدت کا اندازہ تو آپ اس حقیقت سے لگا سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے سسرال والوں کی خواہش کا تذکرہ کرنے کے باوجود یہ واضح عندیہ دیا ہے کہ ان کے خاندانی معاملات ملکی سیاست کے تقاضوں کے تابع رہیں گے۔ حتیٰ کہ وہ بچوں کی خواہش بھی اسی وقت پورا کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں جب ملکی سیاست اور ان کی سیاسی ذمہ داریاں اس کی اجازت دیں گی۔ اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ بینظیر بھٹو کی زندگی میں ان کا سیاسی مشن سب سے طاقتور محرک ہے اور دوسری ہر خواہش اور مصلحت اس پر قربان کی جا سکتی ہے یا اس کے تابع رہ سکتی ہے۔

بینظیر بھٹو فی الحقیقت ایک نہایت ہی مشکل اور نازک صورتحال سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کر رہی ہیں۔

پورے عالم اسلام میں کیا کوئی دوسری غیر شادی شدہ یا نو بیاہتا خاتون سیاسی قیادت کے فرائض ادا کر رہی ہے؟ محترمہ خالدہ ضیاء اور شیخ حسینہ واجد کی خواتین ہونے کے ناطے سیاسی مشکلات بینظیر بھٹو سے بہت کم ہیں۔ خالدہ ضیاء بدقسمتی سے بیوہ ہو چکی ہیں، جبکہ حسینہ واجد بچوں کی ماں بننے کے بعد سیاست میں سرگرم ہوئی ہیں۔ بینظیر نے سیاست کی خاردار وادی میں ایسے وقت قدم رکھا جب وہ کنواری تھیں۔ انہوں نے شادی کے لیے اس وقت تک انتظار کیا جب حالات انہیں اس کی اجازت دیں۔ شوہر بھی ایسا منتخب کیا جو مددگار اور محافظ ہو، اور ان کی سیاست میں حائل نہ ہو۔ دو سال کے دوران وہ ایسا انداز اختیار کرنے میں کامیاب رہی ہیں جو انہیں ایک قدامت پرست مسلمان معاشرے میں قابل قبول بنا سکے۔

مذکورہ حقائق کے پیش نظر کیا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ''آصف علی زرداری'' باشعور، صاحب ثروت، ہمدرد اور با اعتماد شخصیت ہیں۔

''آصف علی زرداری'' کے متعلق ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جو منصوبہ در اصل ''پیپلز پارٹی'' کے خلاف تھا سیاسی مقتدر حلقوں میں غلط فہمیاں پیدا کر دی گئیں، چونکہ اس سے قبل ''آصف علی زرداری'' کو لوگ بحیثیت سیاستدان نہیں جانتے تھے۔ اگرچہ ان کا تعلق سیاستدان گھرانے سے تھا۔ لیکن وہ محترمہ سے شادی کے بعد منظر عام ہوئے، نہ ہی

www.bhutto.org

آصف زرداری نے کبھی سیاست میں آنے کا سوچا تھا اور نہ ہی انہیں ''پبلک فگر'' بننے کی خواہش تھی۔

''محترمہ بینظیر بھٹو'' کی قیادت میں جہد مسلسل کے بعد پیپلز پارٹی 2 دسمبر 1988ء کو برسر اقتدار ہوئی۔ محترمہ کی زیر قیادت پیپلز پارٹی اور خود محترمہ کی مقبولیت سے مخالفین خائف ہونے لگے اور ان کو اپنا سیاسی مستقبل سیاہ و تاریک نظر آنے لگا۔ داخلہ و خارجہ سطح پر پیپلز پارٹی جب اپنے منشور کے مطابق فریضہ سرانجام دینے میں کامیاب نظر آئی تو مخالفین نے ذاتی سیاسی مفادات کے پیش نظر محترمہ کو الجھن میں ڈالنے کا منصوبہ تیار کیا۔ تاکہ نہ صرف پیپلز پارٹی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت ختم ہو بلکہ محترمہ اپنے فرائض منصبی کو پایہ تکمیل نہ کر سکیں اور اس طرح ان کی ذاتی سیاسی حیثیت بھی ختم ہو جائے لہٰذا ان کے شوہر آصف علی زرداری کی کردار کشی شروع کر دی گئی۔

باوجود اس کے کہ اگر آصف زرداری چاہتے تو 1988ء میں قومی اسمبلی کی نشست حاصل کر کے وزارت حاصل کر سکتے تھے۔ اس طرح کرنے سے آصف زرداری کو مخالفین کو منہ توڑ جواب دے سکتے تھے، لیکن آصف علی زرداری کو ان معاملات میں نہ تو دلچسپی تھی اور نہ سیاست کی طرف وہ راغب تھے۔ مخالفین بدستور اپنے منصوبے کے تحت آصف علی زرداری کی مخالفت کرتے رہے۔ ان کی ذات کو مسلسل تنقید کا نشانہ بناتے رہے۔ یہاں تک کہ عوام اور سیاسی حلقوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ حالانکہ یہ وہ وقت تھا کہ صوبائی سطح پر نشست خالی کروا کر آصف علی زرداری وزارت اعلیٰ حاصل کر کے مخالفین کا پروپیگنڈا تہس، نہس کر دیتے، لیکن آصف علی زرداری نے پیپلز پارٹی کی جہد مسلسل اس کی عزت وحمیت کو اپنی ذات سے زیادہ مقدم سمجھا۔

دیکھا جائے تو وفاق اور صوبائی سطح پر سیاست میں باقاعدہ شامل نہ ہونا پارٹی کے لیے پہلی قربانی تھی۔ آصف علی زرداری پیپلز پارٹی کو مقدم سمجھتے رہے اور باوجوہ خاموش رہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی خاموشی کو مخالفین نے استعمال کرتے ہوئے آصف علی زرداری کو آسان ہدف سمجھے رکھا اور اپنے منفی عزائم کی تکمیل کے لیے ہر منفی ہتھکنڈا آزمایا گیا۔ نتیجتاً عوام میں آصف علی زرداری کو مبہم شخصیت بنا دیا گیا۔ شکوک وشبہات کو اس وقت یقین میں بدلنے کا وقت سازگار ثابت ہوا جب۔۔۔۔۔۔۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کو سابق صدر

www.bhutto.org

اسحاق خان نے 6 اگست 1990ء میں 58-2B کے تحت ختم کر دیا۔

''وہی 58-2B جس نے نظریہ ضرورت کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔''

یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ''نظریہ ضرورت'' ہمارے ملک میں تاریخی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ ہمارے ملک میں بدقسمتی سے نظریہ ضرورت سیاست کا خواصہ بن گیا ہے۔ جسے منفی رویہ سے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ ویسے ''نظریہ ضرورت'' بھی کمال کا نظریہ ہے۔ جس کی داد دیے بغیر انسان نہیں رہ سکتا اس لیے کے مفاد پرست عناصر جب چاہیں، جہاں چاہیں اور جس طرح چاہیں اپنے منصوبے خواہ وہ قلیل المدت ہوں یا طویل المدت اپنی مرضی سے پایہ تکمیل کرتے ہیں۔ صدیوں میں رقم ہونے والی تاریخ کو لمحوں میں مرتب کرلیا جاتا ہے۔

''نظریہ ضرورت'' سابقہ حکمرانوں کا بالعموم اور موجودہ حکمرانوں کا بالخصوص وطیرہ بن چکا ہے۔ کیونکہ نظریہ ضرورت کا استعمال حکمرانوں کے ذاتی مفادات کے حصول نیز عوام کو درد آگین حادثات سے دور چار کرنے کا ''مجرب نسخہ'' ہے۔ کائنات کے ہر سوال کا جواب اور اپنی بابت اُٹھنے والی ہر نگاہ کی استفہامیہ لہروں کو لوٹانے کا ہنر نظریہ ضرورت کی ڈھال سے ممکن ہو گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نظریہ ضرورت کا استعمال اور اس کے نتائج بالآخر ثابت قدم آصف علی زرداری اور عوام کو بھگتنا پڑتے ہیں۔ جس کی زندہ مثال 6 اگست 1990ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت کے برطرف ہونے کے ایک ماہ بعد آصف علی زرداری کی گرفتاری ہے۔ (P.M.House) وزیر اعظم کی رہائش گاہ سے ایک ماہ بعد ۔۔۔۔۔۔جیل کی کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا۔ جہاں دنیا بھر کے مسائل آصف علی زرداری کے منتظر تھے۔ اور پھر دو، چار نہیں سیدھے بارہ (12) مقدمات قائم کر دیئے گئے۔ کامیاب منفی منصوبہ بندی کے عین مطابق آصف علی زرداری کو تقریباً اڑھائی برس جیل کاٹنا پڑی مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔

اگر چہ ان پر کسی قسم کا کوئی چارج نہ تھا۔ یہی وہ مقام تھا کہ جہاں ''شہید ذوالفقار علی بھٹو'' کے خون ناحق پر تعمیر پیپلز پارٹی ضیاء دور کے بعد ایک مرتبہ پھر ابتلاء کا شکار ہوئی۔ آصف علی زرداری کے خلاف عائد مقدمات میں باعزت بری ہونا پیپلز پارٹی کی ساکھ بحال کرنے کے مترادف ہو گیا۔۔۔۔ دانشور طبقہ سے عام آدمی تک سب کی سوچ یکساں

www.bhutto.org

تھی خیال پایا جانے لگا کہ آصف علی زرداری کے باعزت بری ہونے سے پیپلز پارٹی کا مستقبل مشروط ہے۔ آصف علی زرداری 12 مقدمات میں سے 9 مقدمات میں بے قصور ثابت ہوئے جس کی بناء پر انہیں باعزت بری کر دیا گیا، اور 3 مقدمات 249 کے تحت عدالت نے ختم کر دیئے۔

آصف علی زرداری کی یہ فتح دراصل پیپلز پارٹی کے روشن مستقبل کی نوید تھی۔ لیکن اڑھائی برس تک بے قصور جیل کاٹنا اور مقید رہنا یقیناً صبر آزما اور حوصلے کا کام تھا۔ جسے آصف علی زرداری نے نبھایا۔ ہمارے ہاں جیلوں کی صورت حال کیا تھی اور کیا ہے؟ میرے خیال میں کوئی پوشیدہ بات نہیں۔ آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جیل کے ایسے خوفناک اور بھیانک ماحول میں آصف علی زرداری کا مقید رہنا دراصل وہ مقام تھا کہ جہاں آصف علی زرداری نے تہیہ کر لیا کہ وہ عملاً سیاست میں آئے گا۔ کیونکہ اپنی مرضی سے زندگی گزارنے والا، آزاد منش، دوست پسند، لج پالنے والا اور نبھانے والا عجب آزاد مرد آصف علی زرداری جیل سے باعزت بری ہو کر جب واپس لوٹا تو وہ اس مقام پر کھڑا تھا کہ جہاں اس کا عملاً سیاست میں داخل ہونا ناگزیر تھا۔

جیل کی صعوبتیں، جھوٹے مقدمات کا سامنا، بے بنیاد الزامات کے پس منظر میں آصف علی زرداری کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ جمہوریت پر عزم راسخ و صحت مند سیاسی اطوار پر ایمان رکھتے ہوئے آصف علی زرداری سیاست کی پرخار وادی میں داخل ہوا۔ 1993ء میں دوبارہ پیپلز پارٹی کی حکومت برسر اقتدار آئی اس بار آصف علی زرداری ''بحیثیت سینئر'' عوام کے سامنے آئے۔ پیپلز پارٹی کے دوسرے دو اقتدار میں آصف علی زرداری کی مرکزی کابینہ میں شمولیت اور پھر ''محترمہ بینظیر بھٹو'' جو مملکت پاکستان کی وزیر اعظم تھیں ان کے شوہر ہونے کی وجہ سے پاکستانی سیاست اور خصوصاً پیپلز پارٹی میں واضح و نمایاں حیثیت حاصل رہی۔

اب ان کی توجہ سیاست کی طرف بھرپور تھی اور پارٹی میں موجودگی سے وہ بہتر طور پر پیپلز پارٹی میں موجود مختلف شخصیات کے اوصاف و عادات سے واقف ہوتے چلے گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کو معلوم ہو گیا کہ پارٹی کے لیے کونسے رہنما شخصیات تہہ دل سے اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں اور وہ لوگ کون ہیں؟ کہ جو پارٹی کے اندر توڑ پھوڑ

www.bhutto.org

اور گروپ بندی کے عزائم رکھتے ہیں ۔ آصف علی زرداری بطور حکومتی نمائندہ 9 فروری 1994ء میں گیارہ ٹن ادویات و اجناس لے کر جب زمین انبیاء و آئمہ طاہرین (عراق) گئے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سلامتی کونسل کی طرف سے 1992ء میں عراق پر اقتصادی پابندیاں عائد کیں جس کی وجہ سے قدرتی وسائل اور ذہنی و قلبی نکتہ نظر سے دنیا کی امیر ترین عوام اجناس و ادویات کی قلت کا شکار ہو گئی۔"

بوڑھے، بچے، جوان اور خواتین کی اموات بوجہ مفلسی ہونے لگیں۔ اس کے پیش نظر آصف علی زرداری عراق گئے تو واپسی پر انہیں عالمی سطح اور بالخصوص پاکستان میں سراہا گیا۔ بحیثیت سفارتکار کسی بھی اچھے سفارتکار کی خوبیاں اور اوصاف بھی آصف علی زرداری میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ جس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔

☆ اس میں کوئی کلام نہیں کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جہاں پاک عراق تعلقات انتہائی سرد مہری کا شکار ہو گئے لیکن آصف علی زرداری نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نہ صرف پاک عراق تعلقات کا جمود توڑا بلکہ پاکستانی قیدی بھی رہا کروائے۔

☆ ایک مرتبہ آصف علی زرداری محترمہ کے ساتھ امریکہ کے دورہ پر گئے جہاں انہوں نے سندھی ثقافت کو اپنی صلاحیتوں کے عین مطابق ناقابل فراموش طریق سے اجاگر کیا۔

☆ دورہ آسٹریلیا میں آصف علی زرداری کی صلاحیتیں نکھر کر اس وقت سامنے آئیں کہ جب انہوں نے یورپی ممالک کو پاکستان میں سرمایہ کاری کے لیے راغب کیا۔ اس سے قبل سابق حکومت اچھے سفارتکار کے فقدان کی وجہ سے ایسا کرنے میں ناکام رہی تھی لہٰذا زرداری صاحب کی بطور اچھے سفارتکار صلاحیتوں کا اعتراف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔

☆ آصف علی زرداری نے کبھی وزارت یا پارٹی عہدے کا مطالبہ نہیں کیا سرمایہ کاری کی وزارت بھی انہیں اس وقت ملی کہ جب پیپلز پارٹی کو برسر اقتدار آئے لگ بھگ اڑھائی سال بیت چکے تھے۔ بطور وزیر وہ ایک وفد لے کر کوریا اور ہانگ کانگ گئے۔ ان دونوں مذکورہ ممالک کے ساتھ کئی معاہدے کیے جس کے نتیجہ میں ہانگ کانگ کے مسٹر گورڈن 8 آٹھ ارب ڈالر کی سرمایہ کاری پر راضی ہو گئے۔ اور جنوبی کوریا 4 چار ارب پندرہ

www.bhutto.org

کروڑ ڈالر کی سرمایہ کاری کرنے پر رضا مند ہو گیا۔ صرف ایک دورہ سے آصف علی نے پاکستان کے لیے 12 بارہ ارب پندرہ کروڑ ڈالر کی سرمایہ کاری کی راہ ہموار کی۔

☆ آصف علی زرداری کو کونسل برائے تحفظ ماحولیات کا چیئرمین بنایا گیا تو ان کے سامنے وہی دیرینہ مسئلہ وسائل کم اور مسائل زیادہ درپیش تھا۔ لیکن وہ گھبرائے نہیں بلکہ اپنی فہم راست سے پہلے انہوں نے ملک بھر کے دورے کیے۔ آلودگی کے خلاف رائے عامہ ہموار کی ملک کو سرسبز و شاداب بنانے کے لیے ترغیبات دیں اپنی اَن تھک کاوش سے فقط 1995ء میں کونسل برائے تحفظ ماحولیات کی مہم کے سلسلہ میں تقریباً 27 ستائیس کروڑ پودے لگوائے۔

آصف علی زرداری کی ملک کو سرسبز و شاداب بنانے کی مہم کو کامیاب کرنے کے لیے پٹرولیم اور قدرتی وسائل کے محکمہ نے 10 دس ہزار ایکڑ رقبہ پر 10 دس لاکھ پودے لگائے۔ مختلف بنکوں کی طرف سے 6 کروڑ پودے لگائے گئے۔ جبکہ پاکستان ریلوے نے اپنی ساڑھے پانچ ہزار ایکڑ زمین پر خاصی معقول تعداد میں پودے لگائے اور باقی پانچ ہزار ایکڑ رقبے پر پودے لگانے کا ہدف رکھا۔ اسی طرح سٹیٹ سیمنٹ کارپوریشن نے 16 سولہ ہزار ایکڑ رقبہ پر 80 اسی لاکھ پودے لگائے۔

☆ پیپلز پارٹی 1993ء تا 1996ء برسراقتدار رہی اس عرصہ میں ملک یا حکومت کے متعلق جب بھی مسائل پیدا ہوئے تو آصف علی زرداری نے ہمیشہ فعال کردار ادا کیا۔ لاہور میں منظور وٹو اور پیپلز پارٹی کے درمیان محاذ آرائی ہوئی اور منظور وٹو کی طرف سے پیپلز پارٹی کے کارکنان کے خلاف مختلف اشکال میں زیادتیوں کا سلسلہ عروج پر پہنچا تو پی ڈی ایف کی قیادت نے منظور وٹو کو وزارت اعلیٰ سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا تو پنجاب میں ایک بحرانی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ آصف علی زرداری نے بردباری اور تحمل سے اراکین کو بغیر کسی مراعات یا لالچ کے راضی کر لیا۔ اور اراکین نے برملا پی ڈی ایف کی حمایت جاری رکھی اسی طرح وہ لاہور میں اپنے قیام کے دوران ناراض ساتھیوں کے گھروں پر پہنچ جاتے اپنے اخلاق اور اعتماد سے ان کو منا لیتے اور اتحاد کی فضا قائم کر دیتے۔

☆ سرحد میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم کرنے کی غرض سے آصف علی زرداری نے قابل ذکر جدوجہد کی اور نہایت مثبت کردار ادا کیا۔

www.bhutto.org

☆ حکومت اور تاجران مذاکرات، حکومت اور حلیف جماعتوں کے تعلقات میں تسلسل، ربط اور اعتماد قائم رکھنے کے لیے آصف علی زرداری ہمیشہ پیش پیش رہے۔ کراچی میں دہشت گردی کے واقعات کے خاتمہ کے لیے اور محترمہ کی معاونت کے لیے زرداری ہمیشہ متحرک، فعال، پرخلوص اور انتھک جدوجہد کرتے نظر آتے۔

مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پیپلز پارٹی کی حکومت کو جب بھی کوئی مسئلہ در پیش ہوتا تو کہا جاتا تھا کہ زرداری صاحب کو بھیج دیں مسئلہ حل ہو جائے گا۔

ہر کٹھن گھڑی میں اعتماد ان کی شخصیت میں نمایاں نظر آیا۔ نتیجتاً دھڑے بندی کرنے والے متحرک ہو گئے۔ اس طرح اندرون پارٹی کے بے شمار سیاسی رہنما کھل کر سامنے آئے۔ آصف علی زرداری سیاسی سازشوں سے مکمل آگاہ ہو گئے۔ ابھی وہ اس مسئلہ کا تدارک نہ کر پائے تھے کہ پیپلز پارٹی مخالف قوتوں نے میر مرتضیٰ بھٹو اور محترمہ بینظیر بھٹو کے درمیان سیاسی تضادات کو عجیب و غریب رنگ دیا اور پھر آصف علی زرداری اور میر مرتضیٰ بھٹو میں کشیدہ فضاء قائم کرنے کی کوشش کی۔

منصوبہ ساز کارخانوں میں سنگین منصوبے دھڑا دھڑ دن رات (over time) کے ساتھ بننے لگے ان خطرناک منصوبوں میں ایک المناک منصوبہ میر مرتضیٰ بھٹو کا قتل تھا۔ پھر اسی منصوبے کی کڑی آصف علی زرداری سے منسوب کر دی گئی۔ بعد ازاں الزامات کی ایک بوچھاڑ تھی جو پے در پے آصف علی زرداری پر گزشتہ دور حکومت کی طرح عائد ہوتی چلی گئی ابھی تو ایک منصوبہ آصف علی زرداری اور محترمہ بینظیر بھٹو کے درمیان علیحدگی کا تھا جو ناکام ہوا۔

ایک مخصوص طریقہ کار جسے بین الاقوامی سامراجی قوت کہا جاتا ہے اُس کے اشارے پر وفاداری بدلتے ہوئے ایمل کانسی کی گرفتاری، مہران بنک اسکینڈل، امریکہ نواز پالیسی بلکہ امریکہ کی ہدایت پر سر تسلیم خم کرنے کی صلاحیت کے وارث محترم فاروق احمد لغاری نے چار نومبر 1996ء کی رات پیپلز پارٹی کی حکومت دوبارہ اپنی مقررہ مدت پورا کیے بغیر 58-2B کے تحت ختم کر دیا۔ سابق صدر فاروق احمد لغاری کو پیپلز پارٹی نے ان کی گزشتہ کئی برسوں کی خدمات خاص، محترمہ کو بیٹی کہنے اور بالخصوص وفاداری کے پیش نظر صدر پاکستان مقرر کیا مذکورہ تمام خصوصیات کے حامل فاروق لغاری کا شاید صدر کے عہدہ تک

www.bhutto.org

پہنچنا ہی خواہش و مقصد تھا۔

جیسے ہی یہ خواہش مکمل ہوئی تو سابق صدر فاروق لغاری اپنے مذکورہ اوصاف بھول گئے۔ ''پھر وہی نظریہ ضرورت'' سابق صدر فاروق لغاری پر چند الزامات عائد ہوئے اور ''سرینڈر'' کر گئے اور اپنی ساکھ برقرار رکھنے اور اپنے تحفظات کو پارٹی پر مقدم سمجھتے ہوئے ''پیپلز پارٹی'' کی حکومت برطرف کر دی۔ مکافات عمل کہ فوج و امریکہ پر اعتراض والے فاروق لغاری کے ساتھ مسلم لیگ (ن) کی دو تہائی اکثریت نے بہت برا سلوک کیا۔ نہ صدارت رہی اور نہ پارٹی میں عزت البتہ جیل سے بچ گئے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟ محترم فاروق احمد خاں لغاری اپنا کام کر چکے تھے۔

4 نومبر 1996ء کی تاریخ پیپلز پارٹی سے کہیں زیادہ آصف علی زرداری پر بھاری پڑی اور گورنر ہاؤس سے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اور کہا گیا تھا کہ گرفتاری کے وقت ان کے پاس کروڑوں روپے برآمد ہوئے اس انداز اور اس طرح سے گرفتاری عمل میں لائی گئی کہ لوگ سمجھنے لگے کہ واقعتاً آصف علی زرداری کے پاس سے کروڑوں روپے برآمد ہوئے ہیں یہ الگ بات کہ کروڑوں روپے پرس، جیب میں نہیں رکھے جاتے اور نہ ہی خاص و عام اس قدر بڑی رقم ہمہ وقت اپنے ساتھ لیے پھرتے ہیں۔

بعد ازاں وقت گزرتا رہا اور آصف علی زرداری پر مختلف نوعیت کے مقدمات عائد ہوتے رہے۔ 1996ء سے لے کر 2001ء تک یہ سلسلہ ہائے مقدمات جاری رہا۔

www.bhutto.org

6

''آصف علی زرداری پر عائد مقدمات کا مختصر جائزہ''

نمبر۱	پولوگراؤنڈ ریفرنس	2000ء کو دائر کیا گیا۔
نمبر۲	اے آر وائی گولڈ ریفرنس نمبر 23	2000ء کو دائر کیا گیا۔
نمبر۳	شیکنار ریفرنس	2000ء کو دائر کیا گیا۔
نمبر۴	ٹریکٹر ریفرنس	2000ء کو دائر کیا گیا۔
نمبر۵	ایس جی ایس ریفرنس	2000ء کو دائر کیا گیا۔
نمبر۶	بی۔ایم۔ڈبلیو ریفرنس	2001ء کو دائر کیا گیا۔
نمبر۷	اثاجات (ا) ریفرنس (اندرون ملک)	2001ء کو دائر کیا گیا۔
نمبر۸	اثاجات (ا) ریفرنس (بیرون ملک)	2001ء کو دائر کیا گیا۔

''فوجداری مقدمات''

نمبر۱	مرتضیٰ بھٹو قتل کیس کی ایف آئی آر	1996ء میں درج کی گئی۔
نمبر۲	عالم بلوچ قتل کیس کی ایف آئی آر	1997ء میں درج کی گئی۔
نمبر۳	کنٹینر کیس کی ایف آئی آر	1997ء میں درج کی گئی۔
نمبر۴	سٹیل ملز کیس کی ایف آئی آر	1997ء میں درج کی گئی۔
نمبر۵	نظام قتل کیس کی ایف آئی آر	1996ء میں درج کی گئی۔
نمبر۶	منشیات کیس کی ایف آئی آر	1996ء میں درج کی گئی۔

مقدمات کی مجموعی تعداد۔۔۔۔۔۔۔۔(14)

www.bhutto.org

ویسے تو ان مقدمات کے متعلق قانون دان (وکیل استغاثہ یا وکیل صفائی) ہی بہتر بتا سکتے ہیں۔

☆ ٹریکٹر ریفرنس دائر ہوئے تادم تحریر عرصہ پانچ سال گزر گئے انک کی احتساب عدالت میں ابھی حالت سماعت میں نہیں آیا۔

☆ ایس، جی، ایس ریفرنس تادم تحریر پانچ سال گزر چکے ہیں اور سماعت جاری ہے جو راولپنڈی کی احتساب عدالت نمبر 2 میں کی جا رہی ہے۔

☆ ٹیکنار ریفرنس کو 5 برس بیت گئے اور راولپنڈی کی عدالت نمبر 3 میں فیصلے کا انتظار کیا جا رہا ہے۔

☆ اثاثہ جات ریفرنس کو دائر ہوئے 4 سال کا عرصہ گزر چکا لیکن توجہ طلب ہے۔

☆ پولو ریفرنس کو دائر ہوئے 5 سال بیت گئے ہنوز فیصلہ نہیں سنایا جا سکا۔

☆ مرتضیٰ بھٹو قتل کیس کی ایف آئی آر 1996ء میں کاٹی گئی تقریباً 9 سال گزر گئے لیکن قتل کیس کراچی کی عدالت میں سیشن جج کورٹ تک پہنچ سکا ہے۔

☆ عالم بلوچ کیس کی ایف آئی آر 1997ء میں کاٹی گئی لیکن 8 سال گزر جانے کے بعد حیدر آباد کے سیشن کورٹ کی سطح تک ہے۔

☆ نظام قتل کیس کو عرصہ 9 برس گزر گئے ابھی تک کراچی سنٹرل جج کی عدالت میں موجود ہے۔

☆ کنٹینر کیس کی ایف آئی آر 1997ء میں کاٹی گئی لیکن ابھی تک سماعت مکمل نہیں ہو سکی۔

☆ منشیات کیس کے متعلق صرف یہی عرض ہے کہ سابق وزیر اعظم چودھری شجاعت حسین کے مطابق قطعی جعلی کیس ہے

☆ سٹیل ملز ریفرنس میں تقریباً پانچ سال بعد آصف علی زرداری کو مجرم قرار دیتے ہوئے سیشن کورٹ نے ''سزا'' سنائی جس کی اپیل ہائی کورٹ میں زیر غور رہی اور ابھی اپیل کی منظوری کا فیصلہ باقی تھا کہ آصف علی زرداری کو سٹیل ملز ریفرنس میں ''احتساب عدالت راولپنڈی'' سے 7 (سات) سال قید، 4 (چار) کروڑ روپے جرمانہ اور 10 (دس) برس تک نا اہلی کی دی جانے والی سزا کو۔۔۔۔ لاہور ہائی کورٹ کے 2 (دو) ججز مولوی

www.bhutto.org

انوار الحق اور سردار محمد اسلم پر مشتمل بینچ نے ستمبر 2004ء کو اپنا مختصر فیصلہ سناتے ہوئے کالعدم قرار دیا اور آصف علی زرداری کو باعزت بری قرار دیا نیز فیصلے میں یہ بھی کہا گیا کہ ''اگر آصف علی زرداری کے خلاف کوئی اور مقدمہ نہیں ہے تو انہیں فوری طور پر رہا کر دیا جائے۔

☆ بی، ایم، ڈبلیو ریفرنس 2001ء میں دائر ہوا تقریباً 5 (پانچ) سال گزر گئے راولپنڈی کی احتساب عدالت میں سماعت جاری ہے۔

مذکورہ 14 مقدمات میں سے 13 مقدمات میں آصف علی زرداری کی ضمانت ہو چکی تھی صرف ایک مقدمہ بی، ایم، ڈبلیو ریفرنس جس کے مطابق آصف علی زرداری نے چند لاکھ روپے اپنی کار کا ٹیکس کم ادا کیا تھا۔ اس کیس میں ضمانت ایک طویل عرصہ تک نہ ہو سکی اگرچہ اب تمام مقدمات میں آصف علی زرداری کی ضمانت ہو چکی ہے۔ چار پانچ مقدمات میں سے وہ باعزت بری قرار پائے ہیں لیکن بقیہ مقدمات کا ابھی فیصلہ ہونا باقی ہے۔

بلا شبہ آخری و حتمی فیصلہ عدالت ہی نے دینا ہے۔ جو انشاء اللہ ملک و ملت کے وقار اور ملک و ملت کے وسیع تر مفاد میں ہوگا۔ وقت کا بھید نہیں پکڑا جا سکتا، وقت کی پیچیدگیاں نہیں سلجھائی جا سکتیں، وقت کے بدلتے رنگوں کو اپنے مزاج کے مطابق نہیں بنایا جا سکتا، وقت کی رفتار کو نہیں بدلا جا سکتا، اور وقت کے ساتھ بدلتے خیالات کو قابو میں نہیں رکھا جا سکتا۔ کل آصف علی زرداری پیپلز پارٹی اور ملک کے لیے انتہائی خطرناک اور منفی کردار رکھنے والا شخص تھا۔ لیکن آج آصف علی زرداری ''مردِ حر'' ہے۔ جرأت و استقلال، ہمت، ثابت قدمی، حوصلہ اور جہد مسلسل کی علامت ہے۔

جس کی بڑی وجہ یقیناً یہ ہے کہ جب ایک ووٹر یا عام آدمی گاہے بگاہے۔ ملک کے حالات و واقعات سے آگاہ ہوتا ہے اور اس کے اردگرد رونما ہونے والے واقعات اس کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں نیز جب باشعور قومیں سوچتی ہیں تو وہ از خود کوئی نتیجہ بھی اخذ کرتی ہیں۔

اس تیز رفتار دور میں جبکہ سامراجی و استعماری اصطلاحات کا سامنا بھی ہو تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا قوم میں سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میڈیا بالخصوص مجلاتی اداروں میں آصف علی زرداری کے متعلق خیالات بدل چکے ہیں۔ آصف علی

www.bhutto.org

زرداری کو ''مسٹر ٹین پرسنٹ'' کا نام دینے والے آج اسے سچا، کھرا اور اصولوں پر سمجھوتہ نہ کرنے والا شخص مانتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ جب آصف علی زرداری کو زیر حراست لیا گیا تو اس وقت نومبر 1996ء میں مالی بدعنوانی کے الزامات تھے جو اربوں ڈالرز سے شروع ہوئے اور اب صرف لاکھوں روپے تک کس طرح آ گئے؟ نیز بعد میں یہ الزامات کس طرح بڑھتے چلے گئے؟ ان کی کیا وجوہ ہیں؟

نفسیاتی اعتبار سے سوچا جائے کہ ''جب کوئی شخص قتل جیسے اقدام کا مرتکب ہوتا ہے اس کے خلاف، مدعا علیہان اور عینی شاہدین عدلیہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ تمام کارروائی مکمل ہونے کے بعد اسے سزا سناتی ہے تو اس وقت بحیثیت انسان اور انسانیت کے تقاضوں کے پیش نظر، کوئی خوشی نہیں ہوتی، آخر خوشی کیوں محسوس نہیں ہوتی؟ پھر لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ آخر قاتل نے قتل کیوں کیا؟ قتل کے پیچھے کیا عوامل یا کیا محرکات تھے؟ اسی طرح آصف علی زرداری کے متعلق بھی سوچتے ہیں کہ

ایک ایسا شخص جو ابھی ملزم ہے الزام ثابت ہونے اور مجرم بننے سے قبل اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی سزا سے زیادہ سزا بھگت چکا ہے اس کی کیا کیفیت ہوگی؟ اس کے متعلق سوچنے والوں کی کیا کیفیت ہے؟

یہی وہ مقام ہے کہ جہاں آصف علی زرداری کو ''مسٹر ٹین پرسنٹ'' کہنے والے آصف علی زرداری کو سینٹ پرسنٹ ''ضمیر کا قیدی'' اور ''مردحر'' کہتے اور لکھتے ہیں۔ آصف علی زرداری کو فلپائنی مارکوس کے ساتھ ملایا جاتا رہا ہے۔ فلپائن کا مارکوس فلپائن کا ایک آمر۔ فلپائن کی تاریخ میں شاید ہی کوئی حکمران ایسا گزرا ہو جو مارکوس کی ہوش ربا داستانوں، مالی بدعنوانی، پرتعیش طرز حیات، اقربا پروری میں اس سے مماثلت رکھتا ہو لیکن پاکستان میں صرف آصف علی زرداری کی شخصیت کو مارکوس کے ساتھ کیوں ملایا گیا؟

پھر دیکھنے میں آیا کہ بڑے بڑے طرم خان قسم کے سیاست دان قید بند کی صعوبتیں برداشت نہ کر سکے۔ ''خوبصورت نظریہ ضرورت'' ''فلور کراسنگ'' کے ذریعہ اور صوابدیدی حکومتی اختیارات کے پیش نظر نہ صرف جیل و قید سے بچ گئے بلکہ وفاقی و صوبائی سطح پر وزراء و مشیر بن کر ملک و قوم کے مسائل حل کرنے کے لیے اپنے فرائض منصبی ادا کر رہے ہیں۔ یہ الگ بحث و موضوع ہے کہ مسائل کم ہو رہے ہیں یا وقت کے ساتھ ساتھ

www.bhutto.org

بڑھ رہے ہیں؟"

آصف علی زرداری نے ان حضرات کے برعکس صعوبتیں اٹھائیں برے وقت کا جوانمردی اور عزم راسخ سے مقابلہ کیا۔ "سیاہ" بالوں کے ساتھ پابند سلاسل ہوا اور "سفید" بال آ گئے لیکن اس کا موقف کہ "اس کے ہاتھ صاف ہیں" میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کی اولاد چھوٹی تھی اب جوان ہو گئی یہاں تک کہ آصف علی زرداری کی اولاد سیاست میں آنے کا عزم رکھتی اور باقاعدہ سکرین و پرنٹ میڈیا پر اعلان کرتی ہے۔ اس نفسیاتی حقیقت کے پیش نظر کہ لالچی آدمی خوفزدہ ہوتا ہے۔ کرپٹ آدمی میں مصائب جھیلنے کی سکت نہیں ہوتی لیکن آصف علی زرداری اس کے برعکس ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ آصف علی زرداری خودغرض ہوتا تو جلد اپنی پسند کے مطابق دنیا کے کسی بھی خوبصورت علاقے میں جا سکتا تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہ کیا بلکہ خود سے زیادہ پارٹی کو عزت و ہمیت کا مقدم سمجھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا ایک دن اٹک کی عدالت میں گزرتا رہا اور دوسرا کراچی کی عدالت میں ابھی تھکن دور نہیں ہوتی تھی کہ حیدرآباد سے ہوتے ہوئے لاہور ہائیکورٹ سے راولپنڈی کی عدالتوں میں حاضر ہوتا رہا۔ ایک جیل سے دوسری جیل اور پھر ہسپتال۔۔۔۔۔ جیلوں کی بدترین صورتحال جہاں ہر زی شعور زندگی کا ہر پل ہر لمحہ پریشاں اور سانس گراں بار ہوتی ہے اُسی زنداں میں آصف علی زرداری پر اٹھارہ (18) جولائی 1999ء کا ایسا دن بھی آیا کہ جس کی صبح ملک بھر میں افواہ پھیل گئی کہ (خدانخواستہ) کراچی کے سی آئی اے سنٹر میں آصف علی زرداری کو قتل کر دیا گیا اس خبر کے غلط اور غیر حقیقی ہونے کی یقین دہانی اگلے روز میڈیا بھی نہ کر سکا۔ (خیر ہو) ہمارے۔۔۔۔۔ فرض ومنصب شناس پولیس افسران کی کہ جنہوں نے بعد ازاں وقفے وقفے سے مطلع کیا کہ "سی آئی اے سنٹر کراچی میں لاہور کے انسپکٹر اور کراچی کے ایس۔ ایچ۔ او زپر مشتمل ٹیم کی زیر نگرانی پاکستانی تاریخ کے (بزرگ سیاسی قیدی) آصف علی زرداری پر عائد الزام (نظام کیس) کی تفتیش کی جا رہی تھی کہ آصف علی زرداری نے دوران تفتیش گلاس توڑا اور اپنے گلے پر مار دیا پولیس کا مؤقف تھا کہ یہ آصف علی زرداری کی خودکشی کرنے کی کوشش تھی"۔ بعد ازاں جب یہ پوچھا گیا کہ آصف علی زرداری کی زبان سے خون کس طرح نکلنا شروع ہوا؟ تو پولیس کا مؤقف در مؤقف سامنے آیا کہ آصف علی زرداری کا

www.bhutto.org

(السر) پھٹ گیا تھا جس کی وجہ سے زبان سے نہیں بلکہ منہ سے خون نکلنا شروع ہو گیا تھا، خون کے زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے آصف علی زرداری کو پہلے نامعلوم ہسپتال میں رکھا گیا جب حالت نہ سنبھلی تو کراچی کے معروف ہسپتال (آغا خان) میں داخل کروا دیا گیا۔

ہمارے ہاں پولیس کے ''باوثوق ذرائع'' کو تو چیلنج نہیں کیا جا سکتا اور خصوصاً اُس وقت جب وہ اعلیٰ ہدایات کے پیش نظر ملک و ملت کی خدمت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہوں۔ ہمارے ہاں پولیس کے علاوہ بھی باوثوق ذرائع موجود ہیں اور انہیں بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا۔۔۔۔ ان ذرائع کے مطابق معلوم ہوا کہ ''بزرگ سیاسی قیدی'' آصف علی زرداری کو تھرڈ ڈگری پر رکھا گیا، تین راتیں جگایا گیا اور آصف علی زرداری کو ذہنی، قلبی اور جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ جس کا ثبوت یہ دیا جاتا ہے کہ رائڈنگ (گھڑ سواری) کے شوقین آصف علی زرداری کو آج چلنے کے لیے عصا (لاٹھی) کی ضرورت ہے۔ اور فزیوتھراپی اُس کی زندگی کا حصہ ہے۔ آصف علی زرداری ان تمام واقعات کے بعد بھی مسکراتا ہوا نظر آتا ہے۔

''شہید بھٹو'' کے عقیدت مندوں میں ایک نام محترم مرحوم معراج خالد کا بھی لیا جاتا ہے۔ محترم مرحوم معراج خالد کے (نگران) وزارت عظمیٰ کے دور میں اُن سے اکثر استفسار کیا جاتا تھا کہ آصف علی زرداری کو کیوں گرفتار کیا گیا تھا تو اُن کا ایک ہی جواب ہوا کرتا تھا کہ آصف علی زرداری کے خلاف شواہد اکٹھا کیے جا رہے ہیں لہٰذا شواہد اکٹھا کرنے سے پہلے اُن کا زیر حراست رہنا اس لیے ضروری ہے کہ کہیں وہ فرار نہ ہو جائے۔ اس کے باوجود آصف علی زرداری نے اپنے بڑے ہونے کا ثبوت اس طرح دیا کہ ماسوائے (سیف الرحمٰن) آج وہ اپنے تمام مخالفین و منصوبہ گروں کو معاف کر چکا ہے۔

ان مذکورہ باتوں بلکہ تکلیف دہ نکات کے پیش نظر آصف علی زرداری کی شخصیت ''نیلسن مینڈیلا'' کی عہد ساز شخصیت کے قریب ہو گئی ہے۔ نیلسن مینڈیلا نے اپنی 27 سالہ بے گناہ قید کے دوران نسل پرست عناصر کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہ کیا اور آصف علی زرداری پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور و حقوق جو دراصل عوام کے حقوق ہیں کے حصول کے لیے جہد مسلسل، قید مسلسل کا سامنا کرتا رہا۔

بالآخر جب آصف علی زرداری کی رہائی بحکم کورٹ بتاریخ 22 نومبر 2004ء ہوئی

www.bhutto.org

تو مسلسل آٹھ برس سترہ دن لگاتار جیل کاٹنے والے جنوبی ایشیاء کے پہلے سیاسی رہنما بن گئے ان سے قبل مولانا عبدالکلام آزاد کو مسلسل ساڑھے تین سال اور باچہ خان کو ساڑھے پانچ سال قید کا سامنا کرنا پڑا۔ آصف علی زرداری کو جب گرفتار کیا گیا تو ان کی عمر اس وقت اکتالیس برس تھی اور جب رہا ہوئے تو پچاس برس کے ہو چکے تھے۔

آصف علی نے چھ ہزار دن اور راتیں جیل کاٹی۔ جیل قوانین کے مطابق عمر قید کی سزا چھ سال تین ماہ اور اٹھارہ دن ہے۔ جو پچیس سال کے برابر ہوتی ہے۔ جبکہ آصف علی زرداری نے 8 سال سترہ دن مسلسل جیل کاٹی جو مذکورہ جیل قوانین کے مطابق مجموعی اعتبار سے بتیس سال بنتی ہے۔ جو عمر قید سے بھی زیادہ ہے۔ دوران قید ان کے بتیس 32 رشتہ دار اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے جن کی تجہیز و تکفین اور کندھا دینے کا موقع نہ مل سکا۔ رخصت ہونے والے مرحومین میں ان کی والدہ اور تین چچا شامل ہیں۔ اس دوران آصف علی زرداری پانچ مختلف نوعیت کی بیماریوں میں مبتلا ہوئے۔ جن میں خطرناک حد تک شوگر، نظر میں کمزوری، ٹانگ میں لنگڑاہٹ اور ہاتھ کی گروتھ کی بیماریاں شامل ہیں۔

آصف علی زرداری کی گزشتہ 2 سال 4 ماہ قید کے علاوہ صرف موجودہ 8 سال سترہ دن کی قید جو جیل قوانین کے مطابق بتیس سال ہے کی وجہ سے آصف علی زرداری کی شخصیت ''نیلسن منڈیلا'' کی شخصیت سے قریب ہو گئی۔

''نیلسن منڈیلا'' نے نسل پرستوں سے سمجھوتا نہ کیا اور آصف علی زرداری نے جمہوریت مخالفین سے''۔

www.bhutto.org

7

"محترمہ بے نظیر بھٹو"

محترمہ بینظیر بھٹو کی ذات اور ان کی جدوجہد مسلسل کا تذکرہ کرتے وقت عام طور پر جو بات سب سے پہلے کہی جاتی ہے یا محسوس ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ شہید بھٹو کے بعد محترمہ نے پاکستان میں آمریت کے دور میں استحکام جمہوریت کا علم بلند کیے رکھا۔ محترمہ کی مقبولیت کی ایک خاص وجہ ان کے جمہوری طریق کار پر سخت اذیتوں کے لامتناہی سلسلوں کا سامنا کرنے کے باوجود عمل پیرا رہنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محترمہ کا یقین اور اعتماد پختگی کی معراج نظر آتا ہے۔ "نیز" محترمہ نے آئین و قانون کی بالادستی جمہوریت کے ذریعے سول سوسائٹی کی مضبوطی کی جو عمارت قائم کی ہے اس کی دیواریں اور چھت نئے ذہن، نئے مسائل اور پختہ عزم سے مستفیض ہیں۔

شہید ذوالفقار علی بھٹو کا مشن جو آمریت کی نذر ہو چلا تھا اور جس کو آمریت کے طویل عرصہ میں عملی جدوجہد سے ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی اور تصور جمہوریت سے عوام کو نا آشنا کرنے کے لیے ہر طریقہ اپنایا گیا مگر محترمہ نے اس گھناؤنی سازش کو دار رسن، قاتل، واعظ اور قید تنہائی سے لے کر دیار غیر کی صعوبتیں اٹھانے تک صبر آزما مراحل سے گزر کر ناکام و نامراد کیا۔ محترمہ بینظیر بھٹو کو اپنے شہید والد سے ورثے میں جو ذمہ داریاں ملیں انہیں پورا کرنے کے لیے پہلا مرحلہ تو خود والد کی پھانسی کو برداشت کرنا تھا۔ محترمہ خود پابند سلاسل تھیں اور والدہ ان کے ساتھ۔ جبکہ دونوں بھائی اور بہن جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ ان کے تاریخ ساز والد کے قتل کی سازش کرنے والی قوتوں نے ہر منفی رویہ اور طریقہ اپنایا کہ جو ان طاقتوں کے بس میں تھا۔

محترم نفیس صدیقی کے الفاظ میں بین الاقوامی اور پاکستان کے داخلی مخصوص حالات کا مبنی پر حقیقت تجزیہ کچھ اس طرح سے پہلے خارجی سطح پر مختلف النوع ہتھکنڈے

www.bhutto.org

اختیار کیے گئے۔ ''وہ ہتھکنڈے یہ کہ:

شہید ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوری قوم پرست راہ عمل کو کچل دیا جائے۔ اس وقت اگر امریکہ نے یہ پالیسی اختیار کر رکھی تھی تو سوویت یونین بھی شہید بھٹو کی قوم پرستی کا حامی نہیں تھا کیونکہ امریکی ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کے کنٹرول میں چلنے والی عالمی سرمایہ داری نظام کی سرپرستی نام نہاد سوشلسٹ ملکوں کو اپنے کنٹرول میں چلا کر کر رہا تھا۔ اس صورتحال میں امریکہ اور سوویت یونین کی پالیسی اگرچہ بظاہر آپس میں سخت دشمنی کی تھی لیکن بھٹو کے اس ڈیمو کریٹ نیشنل ازم کی مخالفت یہ دونوں سپر طاقتیں کر رہی تھیں۔ کیونکہ شہید بھٹو کے اپنے ثقافتی سوشلزم میں اسلام کے اصولوں کی روشنی میں جو نظریہ پیش کیا گیا تھا وہ سوشلزم اور فنڈامنٹل ازم کو ملانے کا نظریہ نہیں تھا بلکہ سوشلزم اور تصوف کو ملا کر بڑھنے کا نظریہ تھا۔ اس تصوف کی بنیاد، اسلامی ملکوں میں پانچ چھ سو سال پہلے شیخ محی الدین ابن عربی نے رکھی تھی۔

امریکہ اور سوویت یونین اس بات کو بھانپ گئے تھے کہ ذوالفقار علی بھٹو'' ہے جمالو'' کے گیت گا کر اور تیسری دنیا کی حریت پسند قوموں کو متحد کر کے جو ثقافتی اور سیاسی تحریک چلا رہے ہیں وہ آخر اس خطے میں غلبہ حاصل کر جائے گی اور پاکستان ایٹمی طاقت کا مرکز بن کر اقتصادی حوالے سے بھی تیسری دنیا کی قیادت کرنے والا ملک بن جائے گا۔ بھٹو دونوں سپر طاقتوں کے لیے خطرہ بن چکے تھے۔ جو آپس میں ایک دوسرے کی دشمن تھیں۔ علاوہ ازیں سوویت یونین کو یہ بھی شکایت تھی کہ بھٹو نے چین اور امریکہ کے درمیان صلح کروائی ہے جبکہ بھٹو کا مقصد چین کو امریکہ کا ایجنٹ بنانا نہیں بلکہ چین کو جدید ٹیکنالوجی حاصل کرنے کی سہولتیں دلوا کر ایک متوازن طاقت بنانا تھا جو پاکستان کے ساتھ مل کر ایٹمی ترقی میں بھی مدد دیتا رہے اور سپر طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی آگے بڑھتا رہے۔ اس صورت حال میں محترمہ بینظیر بھٹو کو وراثت میں کوئی سلطنت نہیں ملی تھی بلکہ ایک تحریک ملی تھی جو عالمی سامراج اور فنڈامنٹل ازم کے اتحاد کے جبر و ستم کا مقابلہ بھی کر رہی تھی اور سوویت یونین کے مکینیکل سماجی ڈھانچے کے مقابلے میں انسان دوست سوشلسٹ نظام استوار کرنے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

بہت چھوٹی عمر میں باپ کی پھانسی اور بھائیوں کی جلا وطنی، پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو لگنے والے کوڑے اور پھانسیاں اور اپنی والدہ کی گرفتاری کے دکھ ملے تھے۔

www.bhutto.org

پہلے پانچ سال بینظیر بھٹو نے اسی عذاب میں گزارے۔ مغربی ملکوں کی یونیورسٹیوں کے بعد پاکستان کی جیل اور مارشل لاء کے عذاب کا مقابلہ کرتے کرتے ان کی ذات از خود انسان کی نجات کے لیے جدوجہد کی تعلیم دینے والی یونیورسٹی بن گئی۔ سامراجی قوتوں نے شہید بھٹو کے خلاف دوسرا ہتھکنڈا یہ استعمال کیا تھا کہ پاکستان کی قدامت پسند مذہبی جماعتوں، ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کا مال امپورٹ کرنے والے تاجروں، ایسٹ انڈیا کی سرپرستی میں تربیت حاصل کرنے والی پاکستانی بیوروکریسی اور جرنیلوں کو عرب ممالک کے رجعت پسند حکمرانوں کی حمایت سے بھٹو کے خلاف استعمال کیا جائے۔

اس سازش کو کامیاب بنانے کے لیے امریکیوں نے 1977ء میں پاکستان نیشنل الائنس (پی این اے) کی قیادت میں منتخب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کرایا اور پی این اے کو بیرونی ملکوں سے کروڑوں ڈالرز کی امداد ملی۔ اس ایجی ٹیشن کے دوران پاکستان میں موجود روس نواز اور چین نواز نام نہاد سوشلسٹوں نے بھی امریکہ نواز جماعتوں کا ساتھ دیا لیکن سیاسی حکمت عملی سے کام لے کر جب بھٹو شہید نے دوبارہ انتخابات کا اعلان کر کے پی این اے کے لیڈروں کو معاہدے پر رضامند کر لیا تو امریکی سامراج کے سب سے بڑے کارندے جنرل ضیاء الحق نے راتوں رات مارشل لاء لگا دیا اور اس معاہدے پر دستخط بھی نہ ہونے دیئے جس کا مسودہ تیار ہو چکا تھا اور پی این اے کے لیڈروں کے پاس اس معاہدے کو مسترد کرنے کی کوئی ہمت باقی نہیں رہی تھی۔ جب مارشل لاء لگا تو یہی پی این اے اس کی وزارتوں میں شامل ہوئی اور مرحوم ولی خان جیسے قوم پرستوں نے اعلان کر دیا کہ پہلے احتساب ہوگا پھر انتخاب ہوگا جس کا مطلب یہ تھا کہ پہلے بھٹو کو پھانسی دی جائے گی۔ اس کے بعد انتخابات ہوں گے۔

بین الاقوامی سیاست میں جو تبدیلیاں بعد میں منظر عام پر آئی ہیں ان کا آغاز 1983ء کے ساتھ ہی ہو گیا تھا جبکہ پاکستان میں ایم آر ڈی کے پلیٹ فارم سے سول نافرمانی کی تحریک چلائی جا رہی تھی اور اس تحریک میں سب سے بڑی قوت صرف پیپلز پارٹی تھی۔ ایم آر ڈی میں باقی پارٹیاں وہی تھیں جو 1977ء میں پی این اے میں شامل ہوئی تھیں۔ یہ پارٹیاں اگر 1981ء میں ایم آر ڈی میں شامل نہ ہوتیں تو ان کا وجود اس طرح ختم ہو جاتا جس طرح جنرل ضیاء الحق کا ڈی پولیٹیکلائزیشن کا نظریہ ختم ہوا۔ ان پارٹیوں

www.bhutto.org

نے ایم آر ڈی کے پلیٹ فارم پر وارد ہونے کا فیصلہ اس لیے کر لیا تھا کہ مارشل لاء کی مخالفت کا نعرہ لگا کر پیپلز پارٹی کو مستقبل میں مجبور کر سکیں کہ نئی حکومت میں حصہ لینے پر آمادہ ہو جائے تا کہ مستقبل میں پیپلز پارٹی کی بالا دستی بھی قائم نہ ہو سکے۔

اگست 1986ء میں ایم آر ڈی کی طرف سے ایجی ٹیشن کرنے کی جو پالیسی بنائی گئی وہ محترمہ بینظیر بھٹو کی نظر میں درست پالیسی نہیں تھی لیکن ایم آر ڈی کی دوسری پارٹیوں اور خصوصاً جمعیت علمائے اسلام کے فیصلے کو محترمہ بینظیر بھٹو نے اس لیے قبول کر لیا کہ ایم آر ڈی کی سربراہی ان دنوں مولانا فضل الرحمٰن کر رہے تھے۔ جبکہ محترمہ بینظیر بھٹو بین الاقوامی تناظر کے حوالے سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ وہ بین الاقوامی سیاسی تناظر کیا ہے۔ جس میں محترمہ بینظیر بھٹو کو جیل سے نکال کر فرانس بھیجنا پڑا اور پھر ان کے بھائی کو شہید کر دیا گیا اور 1986ء میں انہیں پاکستان میں دوبارہ تحریک چلانے کا موقع بھی دیا گیا۔ اس بین الاقوامی سیاسی تناظر کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھنا ہو کہ سوویت یونین میں پرانی بیوروکریسی کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا اور صدر گورباچوف اقتدار میں آئے تو عالمی سیاست کا نقشہ بھی تبدیل ہو گیا پاکستان پر اس تبدیل شدہ نقشے کا سب سے پہلا اثر یہ پڑا کہ افغانستان سے سوویت یونین کی فوجیں واپس بلا لی گئیں۔

امریکہ کو جنرل ضیاء الحق اور ان کے کارندوں کی اس نوکری کی ضرورت باقی نہ رہی جو 1977ء سے ان کو سونپی گئی تھی اگر چہ روسی فوجوں کی واپسی کا مرحلہ 1988ء میں آیا لیکن امریکہ اور یورپ کو اس بات کا پتہ ان دنوں میں ہی چل گیا تھا جب برژنیف کے بعد آندرو پوف سوویت یونین کے صدر بنے اور انہوں نے روسی بیوروکریسی کی سابقہ پالیسیوں پر تنقید کی اور روسی بیوروکریسی کا وہ اصلاحات پسند گروپ اوپر آنے لگ گیا جس کی سربراہی صدر گورباچوف کر رہے تھے۔ ان دنوں امریکہ کے اندر بھی صدر ریگن کی حکومت پر یہ تنقید شروع ہو گئی تھی کہ دشمن کا خون بہانے کی جس پالیسی پر عمل کر کے امریکہ افغانستان میں افغان مجاہدین اور ضیاء الحق کو استعمال کر رہا ہے یہ پالیسی اب مستقبل میں بالکل فائدہ مند نہیں رہے گی۔

ماضی میں بھی اس پالیسی نے اخراجات میں اضافہ کیا ہے اور مفادات کم مہیا کیے ہیں۔ اس صورتحال میں امریکہ کے لیے پاکستان کی وہ اہمیت نہیں رہی تھی جو ماضی میں اس

www.bhutto.org

کو حاصل تھی کیونکہ پاکستان امریکہ کا کرائے کا گوریلا بن کر افغانستان میں لڑنے والے افغان مجاہدین کی مدد کر رہا تھا۔ مختصر لفظوں میں اسی بات کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ امریکہ نے پاکستان کو جس ڈیوٹی پر لگایا ہوا تھا گورباچوف نے اس افغانستان سے فوجیں واپس بلا کر اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہنے دی اور اس اسامی کے ختم ہونے کا اندازہ امریکہ نے 84-1983ء میں کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ امریکہ اور یورپ نے شدت سے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ پاکستان میں جن مولویوں اور جرنیلوں کو امریکہ نے افغان مسئلے کی بنیاد پر ترقی دی تھی وہی مولوی اور جرنیل ہیروئن فروشی اور کلاشن کوف فروشی کے کاروبار میں ڈرگ مافیا کے ساتھ مل گئے ہیں اور اس ڈرگ مافیا نے پاکستان کو ہیروئن فروشوں کی پناہ گاہ بنا کر پوری مغربی دنیا میں جال پھیلا دیا ہے۔

امریکہ اور یورپ نے دس سال پیشتر یہ منصوبہ بنایا تھا کہ پاکستان میں بھٹو جیسے لیڈر کو ختم کرنے کے لیے ڈرگ مافیا کی مدد لی جائے لیکن جب ڈرگ مافیا نے پاکستان کی سیاست پر مکمل قبضہ کر لیا اور کالے دھن کے ذریعے پاکستان کی معیشت بھی قابو میں کر لی تو امریکی حکام نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ ڈرگ مافیا تو وہ حکمران طاقت بن گئی ہے جس نے امریکہ کے شہروں میں بھی کوڑا کرکٹ اٹھانے کے ٹھیکے اپنے کارندوں کو لے دیئے ہیں اور امریکی حکام میں بھی اثر و رسوخ پیدا کر لیا ہے۔ یورپ کی معیشت میں ڈرگ مافیا نے جو جال پھیلایا تھا اس سے ملٹی نیشنل کارپوریشنیں بھی پریشان ہو گئی تھیں۔ اس لیے امریکہ اور یورپ نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ پاکستان میں فنڈامنٹل ازم ڈرگ مافیا اور افسر شاہی کی قوت کو نیچے لایا جائے۔ اس صورتحال میں امریکیوں اور یورپیوں کو محترمہ بینظیر بھٹو کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑ گئے اور انہوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ بینظیر بھٹو اگر ایٹم بم بنانے کا ارادہ ترک کر دیں تو ان کی جمہوریت کو قبول کر لیا جائے۔ علاوہ ازیں امریکہ کو ایک اور نقصان بھی پہنچا اور وہ یہ کہ سوویت صدر گورباچوف نے یورپ میں ایٹمی اسلحہ کے خلاف تحریک چلانے میں کامیابی حاصل کر لی اور خصوصی طور پر مغربی جرمنی کو یہ پیشکش کر دی کہ سوویت یونین مشرقی جرمنی کو اس کے ساتھ ملانے پر تیار ہے۔

اس پیشکش کی بنیاد مغربی جرمنی نے سوویت یونین کے ساتھ تیل اور گیس کی خرید و فروخت کے معاہدے کرنے شروع کر دیئے اور امریکہ کے فوجی اتحاد نیٹو سے ہاتھ

www.bhutto.org

کھینچ لیے۔ دوسری طرف سوویت یونین نے مشرقی یورپ کے ملکوں کے بیوروکریٹک ریاستی ڈھانچے کو توڑ دیا اور وہاں بھی جمہوری ڈھانچے بنانا شروع کر دیئے۔ اور جرمنی جیسے ملکوں کو یہ پیشکش کر دی کہ ان کی مشینیں بنانے والی جو صنعتیں خسارے میں جا رہی ہیں وہ ان کی مشینوں کو مشرقی یورپ میں سرمایہ کاری کے لیے لگا لیں۔ اس پیشکش سے بھی یورپی ملک امریکہ کا ساتھ چھوڑنے لگے اور امریکہ کے میزائلوں کی جو خرید و فروخت یورپ میں ہوتی تھی وہ کم ہو گئی۔ اس طرح بھی امریکہ نے سوویت یونین کے ساتھ اپنے رویئے میں تبدیلی کر لی اور تیسری دنیا کے ممالک میں امریکہ کی قوت کم ہوتی چلی گئی۔ جبکہ سوویت یونین نے تیسری دنیا کے ممالک پر دباؤ ڈالنے کا راستہ چھوڑ دیا اور اپنا رُخ یورپ کے ساتھ اتحاد کرنے کی طرف موڑ لیا۔ امریکہ اور ایک اور نقصان یہ پہنچا کہ جاپان کی آٹو موبائل اور الیکٹرونکس کی صنعت نے امریکہ کی اندرونی اور بیرونی منڈیوں پر اپنی بالا دستی قائم کر لی۔

اس صورتحال میں امریکہ کو پاکستان کے بارے میں یہ خیال آیا کہ اس کے کرائے کے گوریلوں کے خلاف پاکستان میں جو تحریک پیپلز پارٹی چلا رہی ہے وہ اب مزید آگے بڑھ کر امریکہ کا مکمل صفایا کر دے گی۔ جبکہ فنڈامنٹل ازم کے علمبردار اپنی آمریت کو قائم رکھنے کے لیے امریکہ کی سرمایہ دارانہ ثقافت کو ڈرگ مافیا کے ایجنٹ بن کر ختم کرا دیں گے۔ لہٰذا امریکہ کے لیے صرف یہی راستہ باقی رہ گیا تھا کہ وہ پیپلز پارٹی کی جمہوریت کو قبول کرے اور مکمل مفادات حاصل کرنے کی بجائے کچھ کم مفادات حاصل کرنے کے مقام پر آ جائے۔ دوسری طرف محترمہ بینظیر بھٹو کو پوری طرح یہ احساس تھا کہ ان کی پارٹی کو دس گیارہ سال کی لڑائی کے بعد آگے چلنا ہے تو کچھ دم لے کر چلے اور دم بھی اس طرح لے کہ کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر حکومت میں جا کر اپنے کارکنوں کو کچھ سہولیات فراہم کر دے اور تاجروں، ملاؤں اور افسروں کی حکومتی اجارہ داری کے مقابلے میں مڈل کلاس کو شامل کر کے اس اجارہ داری کو کمزور کر دے محترمہ بینظیر بھٹو کی یہ پالیسی قدرے کامیاب بھی ہو گئی اور 1988ء کے الیکشن کے بعد ان کو حکومت بنانے کا موقع مل گیا۔

10 اپریل 1986ء کا دن اتنی آسانی سے نہیں آیا تھا بلکہ اس سے قبل محترمہ نے مختلف النوع اذیتیں، قید تنہائی، شہر بدری سے صوبہ بدری اور پھر جلاوطن ہونے تک کی باد مخالف کا سامنا کیا۔ جسے تاریخ سدا یاد رکھے گی۔

www.bhutto.org

8

''محترمہ بینظیر بھٹو گرفتاری، نظر بندی اور جلاوطنی سے ایوان اقتدار تک''

☆ 29 ستمبر 1977ء نظر بند کیا گیا 15 یوم کیلئے۔ بمقام ساہیوال

☆ 16 دسمبر 1977ء نظر بند کیا گیا 15 یوم کیلئے۔ بمقام لاہور

☆ جنوری 1978ء نظر بند کیا گیا تاحکم ثانی۔ بمقام کراچی

☆ جنوری 1978ء صوبہ بدر کیا گیا تاحکم ثانی۔ کراچی سے لاہور

☆ جنوری 1978ء نظر بند کیا گیا 5 یوم کیلئے۔ بمقام لاہور

☆ 18 فروری 1978ء شہر بدر کیا گیا

تاحکم ثانی۔ نواب شاہ سے کراچی اور کراچی سے باہر جانے پر پابندی

☆ 18 مارچ 1978ء نظر بند کیا گیا 3 ماہ کیلئے۔ بمقام کراچی

☆ 4 اکتوبر 1978ء نظر بند کیا گیا 3 ماہ کیلئے۔ بمقام راولپنڈی

☆ 12 فروری 1979ء قید کر دیا گیا

تاحکم ثانی۔ بمقام سہالہ کیمپ راولپنڈی

☆ ستمبر 1979ء کے اواخر میں نظر بند کیا گیا

6 ماہ کیلئے۔ بمقام المرتضیٰ

☆ 8 مارچ 1981ء نظر بند کیا گیا

6 یوم کیلئے۔ بمقام کراچی سنٹرل جیل ریسٹ ہاؤس

☆ مارچ 1981ء قید کر دیا گیا 5 ماہ کیلئے۔ بمقام سکھر جیل

www.bhutto.org

☆ اگست 1981ء قید کر دیا گیا
5 ماہ کیلئے۔ بمقام سکھر جیل سے کراچی جیل
☆ جنوری 1981ء نظر بند کیا گیا 2 سال کیلئے۔ بمقام المرتضیٰ
☆ 21 جون 1983ء وطن بدر کیا گیا
3 سال کیلئے۔ پاکستان سے جنیوا

اس پیش کیے گئے جائزے کی روشنی میں بلاشبہ محض رسومیاتی اطوار سے نہیں بلکہ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ہر جمہوریت پسند شہری محترمہ بینظیر بھٹو کو استحکام جمہوریت اور آئین و قانون کی بالادستی کے لیے ان کی ناقابل فراموش و ناقابل بیان قربانیوں پر حد یہ تہنیت پیش کرتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ محترمہ بینظیر بھٹو کی قید و بند اور جلاوطنی کی تاریخوں کی جو تفصیل پیش کی گئی ہے وہ اے کلاس یا بی کلاس نوعیت کی نہ تھیں بلکہ مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ''تاریخ ساز و عہد ساز والد کی نعش سے لے کے بھائی کی نعش تک اُٹھانا پڑی۔ پینے کے پانی سے لے کر کھانے تک، لباس سے لے کر نہانے تک، مطالعہ سے لے کر لکھنے تک، بجلی سے لے کر ٹیلی فون تک، اور ٹیلی فون سے لے کر ٹیلی ویژن تک، افراد خانہ سے لے کر سہیلیوں اور وکلاء تک سے بات کرنے پر پابندی جیسے اذیت ناک و کرب ناک لمحات سے طویل عرصہ محترمہ بینظیر بھٹو دوچار رہیں۔ آفرین کہ ان کے پایہ استقامت کو آمریت کم نہ کر سکی۔ بلکہ ہر پریشانی کے بعد شہید بھٹو کی بیٹی اور ''دختر مشرق'' اپنے اندر ایک نئی توانائی جوش اور جذبہ محسوس کرتیں۔

1977ء سے لے کر 1986 تک 9 برس جو محترمہ کی زندگی میں مصائب آلام آئے ان کی اذیت و ہولناکی اپنی جگہ مسلمہ ہے مگر اس طرح کی تکالیف نے محترمہ بینظیر بھٹو کو اس اہل کر دیا کہ وہ اپنے شہید والد کے بعد پیپلز پارٹی کو ایک مرتبہ پھر حکومت میں لا سکیں۔ 10 اپریل 1986ء کا دن اور محترمہ کا فقید المثال استقبال اس بات کی گواہی تھی۔ حالانکہ اس سے قبل انٹیلی جنس ایجنسیوں کی جائزہ رپورٹیں یہ بتا رہی تھیں کہ محترمہ کا استقبال اسقدر شاندار نہ ہو سکے گا۔

17 اگست 1986ء کو ضیاء الحق طیارے کے حادثہ کا شکار ہو گیا۔ اس کے بعد پاکستان کے حساس اداروں نے ممکنہ تسلی کی کہ کہیں اس حادثے میں محترمہ یا بھٹو خاندان کا

www.bhutto.org

بے نظیر بھٹو

www.bhutto.org

کوئی ہاتھ تو شامل نہیں لیکن ضیاء الحق کے طیارے کو پیش آنے والے حادثے میں کسی بھی سطح پر اور کسی بھی طور پر یہ ثابت نہ ہوا کہ اس حادثے میں خدانخواستہ محترمہ بینظیر بھٹو یا بھٹو خاندان کا کوئی فرد ملوث ہے۔ تمام تر کارروائی کے بعد جب یہ ثابت ہوا کہ محترمہ تخریب کاری سے نہیں بلکہ انتخابات کے ذریعے اقتدار میں آنا چاہتی ہیں تو پھر محترمہ بینظیر بھٹو کو 1988ء مشروط طریقہ سے شریک اقتدار کیا گیا۔ جبکہ محترمہ بینظیر بھٹو کو بعض سیاستدان کہ جن کے فوج کے ساتھ خوشگوار تعلقات تھے انہوں نے محترمہ کو ملک چھوڑ جانے کا مشورہ دیا اور کہا کہ ''محترمہ بینظیر بھٹو نے اگر ایسا نہ کیا تو خدانخواستہ انہیں قتل کر دیا جائے گا۔''

میرے نزدیک قتل کا منصوبہ کی پیشن گوئی کرنے والے غلط کہہ رہے تھے۔ البتہ محترمہ کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ غلام اسحاق خان اور جنرل مرزا اسلم بیگ انہیں سیاست سے باہر کرنا چاہتے ہیں۔ اور پھر محترمہ کا پہلا دور حکومت سازشوں کی نذر ہو گیا۔ اگرچہ 26 ستمبر 1990ء کو پشاور ہائی کورٹ کے فل بنچ نے سرحد اسمبلی کو بحال کر دیا جسے بعد میں کالعدم قرار دے دیا گیا جس پر محترمہ نے جنرل مرزا اسلم بیگ کو کہا کہ وہ غلام اسحٰق خان کی جگہ وسیم سجاد کو قائم مقام صدر بنا دیں کیونکہ غلام اسحٰق خان کی شخصیت اب متنازعہ ہے لیکن فوج کے سربراہ نے بوجوہ ایسا نہ کیا اور کوشش کی کہ بینظیر بھٹو کو ہمیشہ کے لیے اقتدار سے اور سیاست سے الگ کر دیا جائے لیکن بین الاقوامی دباؤ کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ اس دباؤ میں امریکی وزیر خارجہ جیمز بیکر کا خاص کردار تھا۔

لیکن جی ایچ کیو اور ایوان صدر میں محترمہ بینظیر بھٹو کو شکست فاش سے دوچار کرنے کے تمام تر انتظامات مکمل تھے۔ شہید ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے آخری ایام میں محترمہ کو کہا تھا کہ ''ایک وقت آئے گا کہ جب عوام انہیں مسند اقتدار پر بٹھائیں گے اور جب کبھی بھی تمہاری حکومت ختم ہو تو تم گھبرانا نہیں بلکہ حالات کا مقابلہ کرنا'' یہی وجہ تھی کہ اقتدار کے خاتمہ کے بعد محترمہ نے بڑی پامردی اور استقامت سے نامساعد حالات کا مقابلہ کیا۔ 1990ء میں ان کی حکومت کے خاتمہ کے بعد غلام اسحٰق خان اور غلام مصطفیٰ جتوئی نے کثیر تعداد میں اُن کے خلاف ریفرنس تیار کیے نیز ان کے شوہر آصف علی زرداری کو گرفتار کر لیا گیا اور 11 مقدمات عائد کر دیئے گئے۔ جو اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ حکمران محترمہ کو مقدمات میں الجھا کر طویل عرصہ تک سیاست سے دور رکھنا چاہتے تھے۔

www.bhutto.org

9

''محترمہ بینظیر بھٹو کو درپیش خطرات اور الزامات''

☆ محترمہ پر الزام تھا کہ انہوں نے سکھ حریت پسندوں کی فہرست راجیو گاندھی کو بھجوائی تھی بعد ازاں اپوزیشن یہ الزام کسی طور پر ثابت نہ کر سکی۔

☆ بینظیر بھٹو نے حاجی اقبال بیگ جس کا بین الاقوامی اسمگلروں میں شمار تھا۔ امریکہ کے حوالے کیا تھا۔ لہٰذا ڈرگ مافیا بھی محترمہ کے درپے تھا۔

☆ ایم کیو ایم اور سندھ کی انتہا پسند تنظیمیں بھی محترمہ سے نالاں تھیں۔

☆ پاکستان میں موجود عرب باشندے کے جنہوں نے افغانستان اور روس جنگ میں اپنا کردار ادا کیا تھا محترمہ کی حکومتی کارروائیوں سے ناراض تھے۔

☆ 26 مارچ 1991ء کو سنگاپور ائیر لائنز کا طیارہ اغواہ کیا گیا جس میں 130 مسافر تیار تھے اس کے اغواہ کا الزام بھی محترمہ پر عائد کیا گیا۔

☆ ایک طرف تو انتخابات کی تیاریاں جاری تھیں تو دوسری طرف غلام اسحٰق خان، غلام مصطفیٰ جتوئی اور جنرل مرزا اسلم بیگ محترمہ بینظیر بھٹو کے خلاف کرپشن کے ثبوت اکٹھا کرنے میں مصروف تھے۔

محترمہ بینظیر بھٹو اپنے خلاف ہونے والی بے جاہ سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے امریکی سیاستدانوں سے مدد طلب کی جس پر باقاعدہ 11 ستمبر 1990ء کو امریکی وزارت خارجہ کے ترجمان نے حکومت پاکستان کو مشورہ دیا کہ بینظیر بھٹو کے خلاف کارروائی سے قبل الزامات کی اچھی طرح جانچ پڑتال کر لی جائے۔ امریکی مشورے کو اگرچہ وقتی طور پر مان لیا گیا لیکن بعد کے شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ محترمہ کے خلاف وقتے وقتے سے الزامات و

www.bhutto.org

ریفرنس دائر ہوتے رہے۔

☆ غیر صحت مند سیاست کی ایک مثال یہ ہے کہ چونکہ غلام مصطفیٰ جتوئی محترمہ کو سیاست سے دور کرنا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے محترمہ کو پیغام بھجوایا کہ ان کے خلاف بدعنوانی کے ثبوت تیار کر لیے گئے ہیں۔ جس کے ذریعہ آپ انتخابات سے نااہل قرار دی جائیں گی اور خود ان کی اور ان کے شوہر کی گرفتاری عمل میں لائی جائے گی۔ دوسرے لفظوں میں ملک چھوڑ دینے کا مشورہ یا دھمکی تھی۔

لیکن وقت و حالات نے ثابت کیا کہ محترمہ پر لگائے جانے والے الزامات سراسر جھوٹے اور بیہودہ تھے۔ سابق صدر غلام اسحٰق خان، نگران وزیراعظم غلام مصطفیٰ جتوئی اور جنرل مرزا اسلم بیگ نے جس انداز اور طریقہ کار سے محترمہ کے خلاف کرپشن، اقربا پروری اور محترمہ کی شخصیت کو متنازعہ اور مسخ کرنے کی کوشش کی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محترمہ کی شخصیت اسٹیبلشمنٹ اور فوج کے لیے کبھی بھی کوئی خاص پسندیدہ نہیں رہی تھی۔

بحیثیت ادارہ فوج جہاں قابل ستائش و قابل تکریم ہے وہاں وطن عزیز میں حکومت قائم کرنے اور گرانے میں کلیدی کردار کی حامل ہے۔ اور پھر ہماری تاریخ اس بات کی شاہد ہے۔ اسی استدلال کو پیش نظر رکھا جائے تو کوئی ابہام باقی نہیں رہتا کہ وہ کیا وجوہات تھیں کہ محترمہ کا پہلا دور حکومت انتہائی مختصر ٹھہرا؟

فقط ایک سال آٹھ ماہ اور چار یوم۔ نظریہ ضرورت کی کوکھ سے جنم والی ترمیم 58-2-B کے ذریعہ جمہوریت پر شب خون مارا گیا۔ نتیجتاً 6 اگست 1990ء کو پیپلز پارٹی کی حکومت ختم کر دی گئی۔ 24 اکتوبر 1990ء میاں محمد نواز شریف وزیر آعظم بنے۔ 6 نومبر 1990ء سے لے کر 19 اکتوبر 1993ء تک تقریباً 3 سال صرف چوالیس نشستوں کے ساتھ اپوزیشن بنچوں پر پیپلز پارٹی کو بیٹھنا پڑا۔ بالآخر 19 اکتوبر 1993ء کو محترمہ دوسری مرتبہ وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئیں۔

اس مرتبہ محترمہ فوج اور بیوروکریسی کا کسی حد تک اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکی تھیں۔ دوسری مرتبہ وزیراعظم بننے کے بعد محترمہ خاصی محتاط تھیں۔ احتیاط کے ساتھ ساتھ ان کے اہداف بالکل واضح تھے۔ جن پر وقت ضائع کیے بغیر محترمہ نے عمل درآمد شروع کیا۔

www.bhutto.org

10

''محترمہ بینظیر بھٹو کے اہداف اور کامیابیوں کا ایک تقابل''

''اہداف:''

۱۔ صوبوں کے جائز حقوق کی فراہمی۔
۲۔ عوام دوست اور عوام کی خدمت گزار انتظامیہ۔
۳۔ سستے اور فوری انصاف کی فراہمی۔
۴۔ بلدیاتی اداروں کی مضبوطی کے لیے اختیارات میں اضافہ۔
۵۔ قرضہ جات واپس نہ کرنے والوں کا احتساب۔
۶۔ غیر مشکوک نجکاری کا عمل۔
۷۔ کشمیر پر بھارتی تسلط سے چھٹکارا۔
۸۔ بھارت سے بہتر تعلقات۔
۹۔ دفاع کو مضبوط بنانا۔
۱۰۔ جوہری پروگرام کی حفاظت۔

''کامیابیاں:''

نمبر۱۔ اپریل 1996ء کو محترمہ امریکہ سے یقین دہانی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں کہ 358 ملین ڈالرز کی رقم جو ایف 16 کی خریداری کے لیے امریکہ کو دی گئی تھی واپس کر دی جائے گی۔

www.bhutto.org

نمبر۲۔ 20 ستمبر 1996ء کو امریکی سینٹ نے پاکستان پر لگائی جانے والی پابندیوں کے خلاف ووٹ دیا جس کے بعد فوجی ساز و سامان کی فراہمی ممکن ہو گئی۔

نمبر۳۔ امریکی سینیٹر مسٹر براؤن کی بدولت 70 ملین ڈالر کی امداد ملنے کا موقع ملا۔

نمبر۴۔ پریسلر ترمیم کا خاتمہ ہوا۔

نمبر۵۔ جولائی 1996ء میں پاکستان پر عائد پابندیوں کے باوجود 18 ایس ایم میزائل "39" خریدنے کا فرانس سے معاہدہ طے پایا۔

نمبر۶۔ چین سے ایٹمی پلانٹ کی تنصیب کے لیے جدید ٹیکنالوجی کا حصول ممکن ہوا۔

نمبر۷۔ کراچی میں قیام امن عامہ کے لیے اپریشن کلین اَپ ہوا اور کراچی کے عوام کو 121 ارب روپے کا "کراچی پیکج" دیا گیا۔

نمبر۸۔ کراچی میں امن عامہ کے بعد بیرونی سرمایہ کاروں نے اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کے معاہدے کیے۔

نمبر۹۔ غازی، بروتھا اور حب ڈیم پراجیکٹ کا آغاز کیا گیا۔ تھرمل یونٹ لگائے گئے برائے حصول توانائی۔ صرف حب پاور پراجیکٹ کے منصوبہ پر 18 ملین ڈالر لاگت کا تخمینہ لگایا گیا جس کے لیے عالمی بینک سے معاہدہ طے پایا۔

نمبر۱۰۔ بلوچستان میں دو ہائی وے تعمیر کیے گئے۔

نمبر۱۱۔ شاہراہ فیصل کراچی دسمبر 1994ء میں فلائی اوور کا افتتاح کیا گیا۔

نمبر۱۲۔ 17 اگست 1994ء لاہور بائی پاس کا منصوبہ کا افتتاح کیا گیا۔

نمبر۱۳۔ غریب کاشتکاروں کو ذاتی ضمانت اور آسان طریقہ کار سے "بیس ہزار" روپے کا آسان شرائط پر قرض دینے کا آغاز کیا گیا۔

نمبر۱۴۔ کاشتکاروں اور بالخصوص چھوٹے زمینداروں کے لیے "عوامی ٹریکٹر اسکیم" کا آغاز کیا گیا۔

نمبر۱۵۔ خواتین پولیس اسٹیشن کا قیام عمل میں آیا۔

www.bhutto.org

نمبر ۱۶۔ مسقط اور عمان سے تعلقات بہتر ہوئے۔

نمبر ۱۷۔ پاکستان اور ایران کے درمیان 1200 میل لمبی گیس پائپ لائن بنے گی جس پر 18 ملین ڈالرز خرچ ہوں گے۔ ایران سے باہمی تعاون کا معاہدہ طے پایا اور ایران نے کشمیر کے مسئلے پر ثالثی کی پیش کش کی۔ ایران نے تیل کی قیمتوں پر خصوصی رعایت پر آمادگی ظاہر کی۔

نمبر ۱۸۔ ترکی سے مختلف معاہدے طے پائے خاص طور پر ترکی پاکستان میں اپنی برآمدات کے لیے وسیع ٹیکس فری زون قائم کرنے کے لیے اپنی سہولتیں اور خدمات پیش کرے گا۔ جس کی سہولت پاکستان کو یورپی منڈیوں تک رسائی حاصل کرنے میں آسانی ہوگی۔

نمبر ۱۹۔ پاکستان اور ترکی مشترکہ کمپنی قائم کرنے کا معاہدہ طے پایا جس کے مطابق وہ کمپنی "2" دو بلین ڈالر سے کام شروع کرے گی۔

نمبر ۲۰۔ پاکستان اور ترکی کے تعاون سے براستہ بلوچستان سڑکیں، ریلوے نظام کا سلسلہ شروع کیا جائے گا جو مسلمان روسی ریاستوں پر اختتام پذیر ہوگا۔

نمبر ۲۱۔ ٹیلی کمیونیکیشن میں خاصی ترقی ہوئی، نادہندگان سے وصولی نئے ٹیلی فون کنکشن، پبلک کال آفسز، ڈیجیٹل لائنوں کی فراہمی، نئے شہروں کو این ڈبلیو ڈی کے رابطہ سے منسلک کیا گیا۔ دور دراز علاقوں میں پی سی اوز کھولنے کے لیے ٹینڈر دیے گئے۔ ٹیلی فون سیٹ کی مینوفیکچرنگ ریکارڈ حد تک محدود ہوئی۔ ٹیلکس مہیا کیے گئے۔

نمبر ۲۲۔ ناقابل فراموش حد تک بے روزگاروں کو روزگار دیا گیا۔

ان کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے مخالفین کو اپنا مستقبل مخدوش ہوتا نظر آ رہا تھا۔ لہٰذا مخالفین نے ہر کامیابی کے روشن و تابندہ پہلوؤں پر بڑی خوبصورتی سے منفی کشیدہ کاری کا عمل شروع کر دیا۔ طرح طرح کی سازشیں کی جانے لگیں اور سادہ لوح عوام کو گمراہ کیا جانے لگا۔ اس وقت اسلامی فلاحی و جمہوری مملکت خداداد پاکستان کی منصب

www.bhutto.org

صدارت پر فائز فاروق لغاری مہران بنک سیکنڈل میں بری طرح پھنس گئے اور دریں اثنا میر مرتضیٰ بھٹو کا پولیس مقابلہ یا سازش کے تحت قتل کر دیا گیا۔ یہ وقت پیپلز پارٹی بالخصوص محترمہ پر سخت تکلیف دہ گزرا مگر اپوزیشن کے لیے حکومت گرانے کے لیے موزوں ثابت ہوا۔

ایک مرتبہ پھر نظریہ ضرورت 58 ٹو بی کا استعمال ہوا اور فاروق احمد لغاری نے پیپلز پارٹی کی حکومت کو ختم کر دیا۔ 58 ٹو بی ایک مرتبہ پھر جمہوریت کی پامالی کا باعث بن گئی۔ پیپلز پارٹی کی آئینی و جمہوری حکومت پر ایک مرتبہ پھر نظریہ ضرورت المعروف 58 ٹو بی بھاری ثابت ہوئی تو آصف علی زرداری کو قید کر دیا گیا اور الزامات و مقدمات کا لامتناہی سلسلہ ان کے خلاف شروع ہو گیا۔ جس کی مختصر صورتحال گزشتہ باب میں پیش کی جا چکی ہے۔

www.bhutto.org

11

"محترمہ بینظیر بھٹو پر عائد مقدمات"

جنوبی مشرقی انگلینڈ میں راک وڈ اسٹیٹ (سرے محل) کی محترمہ بینظیر بھٹو اور ان کے شوہر آصف علی زرداری نے ناجائز طریقہ سے خریداری کی۔ سرکاری اطلاعات کے مطابق راک وڈ اسٹیٹ المعروف سرے محل 1990ء میں آصف علی زرداری نے ایک آف شوز کمپنی جو رمینا پراپرٹیز کہلاتی تھی کے ذریعے خریدا تھا۔ جس کی قیمت چار اعشاریہ تین 4.3 ملین پاؤنڈ ہے۔ سرے محل کے مرکزی ملزمان آصف علی زرداری اور محترمہ بینظیر بھٹو کو ٹھہرایا گیا۔

☆ مگر مذکورہ کمپنی کے۔۔۔۔ رجسٹرڈ شیئر ہولڈرز ثابت نہ ہو سکے۔

☆ سرے محل کا سب سے پہلا الزام میاں محمد نواز شریف نے بحیثیت اپوزیشن لیڈر 1996ء میں قومی اسمبلی کے فورم پر عائد کیا۔ اور مسلم لیگ کے سیکرٹری اطلاعات طارق عظیم نے یہ موقف اختیار کیا کہ "محترمہ اور آصف نے یہ محل ککس بیکس کی ناجائز رقم سے خریدا۔

الزام عائد کرنے والی جماعت رہنما میاں محمد نواز شریف کے ذاتی دو اپارٹمنٹس لندن کے وسط میں موجود تھے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان اپارٹمنٹس میں صرف ایک کی قیمت سرے محل کی پوری قیمت سے زیادہ تھی اور ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سرے محل ناجائز قرار پایا جبکہ پیپلز پارٹی نے رواداری اور جمہوری اقدار کا خیال کرتے ہوئے اپارٹمنٹس کی تشہیر سے گریز کیا۔

☆ موجودہ ق لیگی "سرکاری" حکومت نے اربوں روپے کے غیر ملکی دورے اور

www.bhutto.org

میڈیا پر اخراجات کر دیے تا کہ پیپلز پارٹی کی ساکھ خراب ہوتی رہے۔

نمبر۲۔ ''منی لانڈرنگ کیس''

اگر کوئی شخص غیر قانونی طور پر حاصل ہونے والی رقم سے دس ہزار سوئس فرانک سے زیادہ منافع حاصل کرتا ہے تو وہ سوئس عدالت کے مطابق جرم کا مرتکب قرار پاتا ہے۔ سوئس مجسٹریٹ ڈیوڈ نے آصف علی زرداری، محترمہ بینظیر بھٹو اور جیز شیگل بلیچ کو جرم کا مرتکب قرار دیا تھا۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ مجسٹریٹ ڈیوڈ بین الاقوامی سطح پر منفی طور پر استعمال ہونے والی متنازعہ شخصیت ہیں۔

نمبر۳۔ ''ناجائز اثاثوں کا کیس''

محترمہ بینظیر بھٹو کے خلاف ناجائز اور کرپشن کے ذریعے حاصل کردہ اثاثوں کا کیس 98-1997ء میں دائر کیا گیا۔

نمبر۴۔ ''اے آر وائی گولڈ کیس''

اے آر وائی گولڈ کیس ریفرنس کے مرکزی ملزم اگرچہ آصف علی زرداری کو قرار دیا لیکن شریک ملزمان میں محترمہ بینظیر بھٹو، بریگیڈیئر (ر) اسلم حیات قریشی، ایم سلیمان فاروقی، جاوید طلعت، عبدالرزاق یعقوب، عبدالرؤف، جیز شیگل بلیچ اور جان محمد شامل ہیں۔ بمطابق سرکار نے ان کے خلاف میسرز اے آر وائی ٹریڈرز کو سونا اور چاندی کا درآمدی لائسنس جاری کیا جس کی وجہ سے حکومتی خزانے کو ایک ارب بیاسی کروڑ چوبیس لاکھ چوہتر ہزار روپے کا نقصان ہوا۔

ریفرنس 14 مارچ 1998ء کو راولپنڈی میں دائر کیا گیا اس ریفرنس میں حکومتی سطح و موقف و دلائل کے باوجود ''بوجوہ'' فرد جرم عائد نہیں کی جا سکی۔ البتہ ''256-K'' کے تحت سماعت جاری ہے۔

نمبر۵۔ ''کوٹیکنا کیس''

کوٹیکنا کیس کی مرکزی ملزمہ محترمہ بینظیر بھٹو کو ٹھہرایا گیا ان کے خلاف 14 مارچ 1998ء کو راولپنڈی میں مقدمہ درج کیا گیا۔ اس کیس میں ان کے ساتھ شریک ملزموں میں آصف علی زرداری، بیگم نصرت بھٹو، اے آر صدیقی، ولیم جے پولسٹن، جان اے براڈ

www.bhutto.org

ہرٹس جان دورا اور کرلس کلارک شامل ہیں۔ اس الزام کے مطابق حکومتی موقف ہے کہ انہوں نے میسرز کوٹیکنا سے پری شپمنٹ انسپکشن کنٹریکٹ میں کک بیکس حاصل کیے۔

نمبر ۶۔ ''عوامی/ اوسس ٹریکٹر کیس''

بمطابق حکومتی الزام اس کیس کی مرکزی ملزمہ محترمہ بینظیر بھٹو ہیں جبکہ شریک ملزمان میں نوابزادہ محمد یوسف تالپور، بدرالدین زیدی اور آصف علی زرداری شامل ہیں۔ ان کے خلاف یہ کیس 9 مارچ 1998ء کو اٹک میں درج کیا گیا اس الزام کے مطابق انہوں نے عوامی ٹریکٹر سکیم کے تحت اوسس ٹریکٹر کی درآمد میں کِکس بیکس حاصل کیے جس سے زرعی ترقیاتی بنک آف پاکستان کو 26 کروڑ 83 لاکھ روپے کا نقصان ہوا۔

نمبر ۷۔ ''اختیارات کا ناجائز استعمال''

اختیارات کے ناجائز استعمال کی مرکزی ملزمہ محترمہ بینظیر بھٹو کو بنایا گیا ہے۔ جبکہ شریک ملزموں میں نجم الحسن، غلام قادر شاہ جاموٹ، گلزار حسین قاضی، اے وی ایم (ر) عمر فاروق، ناہید خان اور سرج شمس الدین کے نام آتے ہیں۔ ان کے خلاف پی آئی اے میں 1393 افراد کو بھرتی کرنے کا الزام ہے۔ کراچی میں 15 مئی 1997ء میں مقدمہ درج کیا گیا۔

ان تمام مقدمات کے درست یا غلط ہونے کے متعلق بہتر فیصلہ اور آخری فیصلہ تو ہماری انصاف پسند عدالتیں کریں گی یا ان کی قانونی حیثیت کیا ہے؟ سچ کیا ہے؟ وقت ثابت کردے گا۔

البتہ ''چند'' مقدمات میں آصف علی زرداری باعزت بری قرار دیئے گئے ہیں۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے بلکہ غور طلب ہے کہ بقول۔

سینیٹر فرحت اللہ بابر ''حکمران کبھی اس بات کے متعلق بھی سوچیں کہ محترمہ بینظیر بھٹو کی کردار کشی کے لیے حکومت پاکستان نے قومی خزانے سے کتنے ارب روپے عدالتوں، غیر ملکی دوروں اور الیکٹرانک میڈیا پر لٹائے ہیں؟''

محترمہ بینظیر بھٹو ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں کہ جہاں وسائل کی کوئی کمی نہیں ہے وہ سر شاہنواز بھٹو کی پوتی اور ذوالفقار علی بھٹو کی صاحبزادی ہیں۔ اور پھر آصف علی

www.bhutto.org

زرداری بھی ایک متمول گھرانے کے اکلوتے چشم و چراغ ہیں۔ ذاتی حیثیت میں محترمہ بینظیر بھٹو اور آصف علی زرداری کے پاس اس قدر وسائل ہیں کہ شاید ان پر لگائے جانے والے کرپشن کے الزامات انہیں سیاست سے دور رکھنے کا وقتی طور پر ذریعہ ہوں۔ لیکن سچ کبھی چھپ نہیں سکتا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ ان الزامات کا آخری فیصلہ ہمارے قانون دان اور انصاف پسند عدالتیں ہی بہتر کر سکتی ہیں۔ لیکن یہ بات بحث طلب ہے اور کڑوا سچ ہے۔ ہماری تاریخ شاہد ہے کہ ہمارے ہاں سیاسی شعبدہ بازی سے الزامات عائد کرنا حکمران جماعتوں اور حزب مخالف جماعتوں کا وطیرہ رہا ہے۔ نیز مقدمات کو زیر التوا رکھنا اور تاخیری حربے استعمال کرنا کوئی نئی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج پاکستان بلکہ برصغیر کی تاریخ میں سیاسی طویل قید کا نشانہ آصف علی زرداری بنے اور تا حال ان پر لگائے گئے الزامات ثابت نہ ہو سکے۔ اسی طرح محترمہ بینظیر بھٹو کہ جن کا ووٹ بنک آج بھی پاکستان میں سب سے زیادہ ہے جلا وطنی کے حوالے سے سابقہ تین سال 1983ء تا 1986ء اور موجودہ تقریباً 6 سال ملا کر پاکستان کی تاریخ میں جلاوطنی کا عذاب جھیلنے والی دوسرے نمبر کی سیاسی رہنما ہیں۔

مذکورہ تمام الزامات کے باوجود الیکشن 2002ء میں محترمہ بینظیر بھٹو کی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی ہی سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے والی جماعت ثابت ہوئی ہے۔ بالفاظ دیگر میڈیا ٹرائل اور محترمہ کے خلاف الزامات کی بوچھاڑ ان کی پروقار ساکھ میں کوئی کمی نہیں لا سکی۔ اور آج بھی عوام ان کے وطن واپس آنے کے منتظر ہیں۔

وقت و حالات نے ثابت کیا کہ الزام ساز فیکٹری کے ملازمین کی شبانہ روز کارروائی و کارکردگی محترمہ بینظیر بھٹو کی مقبولیت میں کمی کی بجائے اضافہ کا باعث بنی ہے۔ محترمہ کی عزت و تکریم میں نہ صرف وطن عزیز بلکہ بین الاقوامی سطح پر اضافہ ہوا ہے۔ محترمہ کو قومی و بین الاقوامی سطح پر اعزازات پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ اعزازات بحیثیت پاکستانی نہ صرف محترمہ کے لیے بلکہ پوری قوم کے لیے باعث فخر ہیں۔ اور وہ حکمران کہ ۔۔۔۔ جو محترمہ کے لیے افہام و تفہیم اور برداشت و تحمل کا جذبہ نہیں رکھتے ان کے لیے باعث غور و فکر ہیں۔

www.bhutto.org

12

''محترمہ بینظیر بھٹو کے اعزازات''

☆ دنیا کی پہلی پچاس اہم خواتین میں شمار گنز بک آف ورلڈ ریکارڈ 1996ء

☆ انسانی حقوق کی خدمات پر Brund Kroisky ایوارڈ 1988ء

☆ ریڈ کلف کی طرف سے Phi Beta ایوارڈ 1989ء

☆ مراکو کا سب سے بڑا ایوارڈ

Grand Cordon De Wissan Alaoui 1989ء

☆ فرانس کا اعلیٰ ترین ایوارڈ

Grand Croix De La Legion Honneur 1989ء

☆ یونی فیم کی طرف سے

The Noel Foundation Award 1990ء

☆ ٹوکیو

The Gakhushuin Honorary Award 1996ء

☆ بوسنیا کے صدر کی طرف سے

Golden Medal Daragon of Bosnia Award 1996ء

☆ لاس اینجلس امریکا کے میئر کی طرف سے شہر کی اعزازی چابی دی گئی ۔

1995ء

www.bhutto.org

☆ امریکہ کی طرف سے

Paul Nitze School of Advanced International Science

Medal 1995ء

☆ لاس اینجلس کی کیلیفورنیا یونیورسٹی کی طرف سے Medal 1995ء

☆ ہارورڈ یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈگری

LLD Doctrate of Law 1989ء

☆ سندھ یونیورسٹی پاکستان کی طرف سے اعزازی ڈگری

Doctrate of Law 1994ء

☆ فلپائن کی مینڈ نوسٹیٹ یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈگری

Doctrate 1995ء

☆ پشاور یونیورسٹی پاکستان کی طرف سے اعزازی ڈگری

Doctrate of Law 1995ء

☆ ٹوکیو کا گوشی ایم یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈگری

پی ایچ ڈی اکنامکس 1996ء

☆ کرغزستان کی کرغزی سٹیٹ نیشنل یونین کی طرف سے

اعزازی پروفیسر کا عہدہ۔ 1995ء

☆ قازقستان یاسری قازخ ٹیکس یونیورسٹی کی طرف سے

اعزازی پروفیسر کا عہدہ۔ 1995ء

☆ ٹوکیو ایلومن ایسوسی ایشن آف گاکوشوان کی

اعزازی ممبر شپ۔ 1996ء

☆ امریکن بائیوگرافیکل انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے

2000 میلینیم ایوارڈ 1996ء

☆ امریکن اکیڈمی ایوارڈ 2000ء

☆ تصنیف "Daughter of The East" کو بیسٹ سیلر آف ورلڈ کا اعزاز۔

www.bhutto.org

13

''آدھا سچ''

محترمہ کے خلاف مالی بدعنوانی، کرپشن اور لوٹ مار کے الزامات لگائے گئے جن کا مقصد دراصل پیپلز پارٹی کو بے توقیر کرنا اور احتساب کا لبادہ اوڑھ کر سلطانی جمہوریت پر شب خون مارنا اور جمہوریت کی تباہ کاری کا راستہ ہموار کرنا تھا۔ مگر شب خون مارنے اور جمہوریت کی تذلیل کرنے والے اور اپنے مفادات کو مقدم رکھنے والے یہ بھول گئے کہ عوام کا اجتماعی شعور ہمیشہ درست فیصلے کرتا آیا ہے۔

الیکشن 2002ء کا نتیجہ بلاشبہ اسی اجتماعی شعور و عقیدت کا واضح ثبوت تھا کہ محترمہ کی قیادت میں پیپلز پارٹی حکومت قائم کرنے کے مقام پر پہنچ چکی تھی۔ لیکن پسند۔۔۔۔ اور ناپسند بلکہ بوجہ ''ذاتی عناد'' اشرافیہ نے اپنی خصلت کے عین مطابق ''نظریہ ضرورت'' کا استعمال کیا اور آئین کے آرٹیکل 63-A کو معطل کر دیا۔ فلور کراسنگ کے ذریعے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ کی بدولت کامیاب ہونے والے اراکین قومی اسمبلی کی وفاداری تبدیل کروائی گئی اور ''بھان متی'' کا کنبہ حکومت بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

قرضے ہڑپ کرنے والے کرپشن اور بدعنوانی سے زندگی عبارت کرنے والے ضمیر فروشی کے عوض جیل جانے کی بجائے مسند وزارت تک جا پہنچے اور اشرافیہ ملک و قوم کا مستقبل بنانے میں شب و روز تندہی سے کام کرنے لگی۔

خوشحال پاکستان کے نام پر اربوں روپے کے گھپلوں کا افتتاح ہوا۔ ''حروف تہجی لیگیں'' مل کر ق لیگ کی شکل اختیار کر گئیں۔ ق ''قینچی'' اپنے آپ کو قائداعظمؒ سے نسبت

www.bhutto.org

دینے لگی۔ بنکوں سے سٹیل ملز اور پی ٹی سی ایل تک مشکوک نجکاری کرنے کو ملک کے وسیع تر مفاد کا نام دیا جانے لگا۔ بات بات پر انڈیا سے موازنہ کرنے والے یہ بھول گئے کہ ایٹمی خدمات کو پیش کرنے والوں کو انڈین مسند صدارت پر بٹھاتے ہیں جبکہ ق لیگی ڈاکٹر قدیر خان کو نظر بند کر دیتے ہیں۔ یتامیٰ و مساکین کے فلاحی مدارس امریکہ کی خوشنودی کی نذر ہونے لگے۔

ستانوے فیصد عوام کی حمایت و پسندیدگی کے دعویداروں نے بلدیاتی الیکشن میں اپنے دعوے کو سچ کر دکھایا۔ شہید ذوالفقار علی بھٹو کی قبر کے آس پاس پیپلز پارٹی ہارنے لگی اور اندرون لاہور میں ن لیگ شکست سے دور چار ہونے لگی۔ ہونیوں کے موسم اور معجزاتی دور میں ق لیگ کے رہنما میڈیا پر آ کے ایک دوسرے پر الزام عائد کرنے لگے۔ ڈاکٹر ارباب غلام رحیم ''وزیر اعلیٰ سندھ'' اور امتیاز شیخ زہر اگلنے لگے۔ طلسماتی و کرامتی دور کا نتیجہ کہ وہی زہر تریاق بن جانے لگا۔ پولیس افسر کے منہ پر وزیر مُکا مارنے کی جسارت بھی کرنے لگے اور پھر بھی سب اچھا ہونے لگا۔ حالات و واقعات سے تنگ افراد مینار پاکستان سے کود کر خودکشیاں کرنے لگے۔

کوئٹہ، کراچی، لاہور، ملتان میں دھماکوں کی صورت زر مبادلہ کے ذخائر میں اضافہ کی قربانیاں دی جانے لگیں۔ نئی نئی بلکہ ایسی گاڑیاں جن کا پاکستان جیسا ترقی پذیر ملک تصور نہ کر سکتا تھا ملک میں آنے لگیں۔ افراطِ زر اور مہنگائی کی بدولت ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہونے لگا۔ امریکی صدر بش پاکستان کا دورہ کرنے لگا اور عجیب و غریب رویے کا مظاہرہ پاکستانی وزیر خارجہ کے ساتھ خود اسی کے ملک میں پیش آنے لگا۔ وزیرستان سے بلوچستان تک اپریشن و ایکشن بارودی اطوار و اوزار کے ساتھ ہونے لگے۔ 34 ملین ایکڑ زمین کو سیراب کرنے والا دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام موجود ہونے کے باوجود گندم، پیاز، آلو، ٹماٹر وغیرہ برآمد ہونے لگے۔ ڈیم بنانے کے بھرپور عزم کا اظہار کیا جانے لگا۔ تعلیمی نظام بیرونی آقاؤں کی خوشنودی کو ملحوظ خاطر رکھ کر وضع ہونے لگا۔

غرض امن و امان، تحفظ، اتفاق و اتحاد، آئین، قانون، انصاف اور جمہوریت بام ثریا کو چھونے لگی۔ معیشت چین کو شرمانے لگی۔ ایک وزارت کی کوکھ سے دوسری وزارت جنم لینے لگی۔ ایک مشیری سے دوسری مشیری کا تسلسل قائم ہونے لگا۔ 2007ء میں تھل

www.bhutto.org

اور چولستان کے صحراؤں میں گھر گھر بجلی و پانی پہنچانے کے دعویدار 80رکنی کابینہ ٹھنڈے کمروں میں بیٹھ کر گرم فیصلے کرنے لگے۔ حصول قرض والے کشکول ٹوٹ گئے اور 2005ء تک پاکستان 40 چالیس ارب ڈالر کا مقروض ہوگیا۔ پٹرول کی قیمتوں میں چار پانچ سال میں 45 بار اضافہ ہونے لگا۔ شکر، چینی مافیا کی اصطلاح وضع ہونے لگی۔

قبضہ مافیا، بجلی چور مافیا، پتنگ باز و پتنگ ساز مافیا، رشوت مافیا، ملاوٹ مافیا، انٹری ٹیسٹ مافیا اس قدر مضبوط و مستحکم ہونے لگے کہ جس کی مثال تاریخ پاکستان میں اس سے قبل نہیں ملتی۔ حقیقی اور غیر حقیقی تصور جمہوریت کا نزول ہونے لگا۔ علی ہذا القیاس کہ ملک ترقی کی راہ پر اس قدر تیزی سے گامزن ہے کہ اس کی پالیسیوں کے تسلسل میں ق لیگ ''سرکاری'' جماعت کا اگلے 15 سال تک حکومت میں رہنا ضروری ہے۔ ان کی پالیسیوں کا ثمر ہے کہ آج 2006ء میں اسلامی فلاحی مملکت خداداد پاکستان ناکام ریاستوں میں ٹاپ ٹین پر پہنچ گیا۔ ناکام ریاستوں میں 9 (نواں) نمبر ٹھہرا۔ اس طرح پاکستان ایشیاء کا ٹائیگر بننے لگا۔

ہمارے اندرونی تضاد اور احتساب کے نام پر ذاتی پسند اور ناپسند، دوستیاں اور دشمنیاں اپنی جگہ مگر اپنی اس کتاب میں شہید ذوالفقار علی بھٹو کے تختہ دار پر چڑھائے جانے کا ذکر کرتے وقت جس قدر غم و غصہ مجھے آیا اسی قدر دکھ اور ناقابل بیان اذیت ہو رہی ہے کہ جب میں ''دی فنڈ فار پیس'' کی رپورٹ کے مطابق ناکام ریاستوں میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کو نویں نمبر پر لکھنے پر مجبور ہوں۔ اگرچہ سرکاری طور پر اس رپورٹ کو لغو اور بے بنیاد کہا گیا مگر زندہ قومیں سچائی سے آنکھ نہیں چراتیں بلکہ تحقیق کے بعد اپنی غلطیوں کا ازالہ کرتی ہیں۔

''دی فنڈ فار پیس'' ایک نامور تھنک ٹینک ہے۔ یہ غیر سرکاری ادارہ 1957ء سے امریکی شہر واشنگٹن میں اپنا کام کر رہا ہے۔ اس ادارہ کا منشور دنیا میں قیام امن ہے۔ ''دی فنڈ فار پیس'' نے امریکہ میں خارجہ پالیسی سے متعلق نمایاں جریدے ''فارن پالیسی میگزین'' کے ساتھ مل کر ناکام ریاستوں کی فہرست تیار کرنے کا انتہائی نازک اور حساس کام 2005ء سے شروع کر دیا۔ یہ فہرست مقامی و عالمی اخبارات و جرائد میں شائع ہونے والی خبروں، تجزیوں، مضامین اور کالموں کو مدنظر رکھ کر تیار کی جاتی ہے۔ اس باریک و حساس

www.bhutto.org

کام میں ایک خاص سافٹ ویئر ''Cast'' یعنی Conflict Assessment System Tool کی مدد لی جاتی ہے۔ اس سلسلے کی پہلی فہرست 2005ء میں منظر عام ہوئی۔ جس میں پاکستان 146 ممالک میں ناکام ریاست میں 34 نمبر پر تھا۔ جبکہ دوسری فہرست اپریل کے آخر 2006ء میں سامنے لائی گئی جس میں پاکستان 146 ممالک میں ناکام ریاستوں میں (9) نویں نمبر پر ٹھہرایا گیا۔

پاکستان سے زیادہ ناکام ریاستوں میں سوڈان، جمہوریہ کانگو، آئیوری کوسٹ، عراق، زمبابوے، چاڈ، صومالیہ اور ہیٹی کے نام آتے ہیں۔ جبکہ افغانستان کا نمبر بھی دسواں ہے۔ گویا تورا بورا ہونے کے باوجود افغانستان اب بھی ہم سے زیادہ مستحکم ہے۔ اسی طرح بنگلہ دیش کا نمبر 19، نیپال 20، سری لنکا 25ویں نمبر پر ہے۔ اپنا آدھا حصہ کٹوا دینے کے باوجود دنیا کا تیسواں بڑا ملک پاکستان ہے۔ جس کا رقبہ 7 لاکھ 96 ہزار مربع کلومیٹر ہے۔ بے شمار قدرتی نعمتوں سے مالا مال ناکام ملک کس طرح ہوا؟ اگر ''دی فنڈ فار پیس'' اور فارن پالیسی میگزین کے طریق کار کا جائزہ لیا جائے تو علم ہوتا ہے کہ ناکام ریاستوں کی فہرست تیار کرتے ہوئے بارہ (12) مختلف پیمانے استعمال کیے جاتے ہیں۔

سوشل سیکٹر کے چار پیمانے:

۱۔ ملک کے اندر بڑھتی ہوئی آبادی کا دباؤ۔
۲۔ پناہ گزینوں کی کثیر تعداد۔
۳۔ بے گھر افراد کی نقل و حرکت۔
۴۔ گروہی رقابتیں اور پروفیشنل ہنر مند اور کاروباری افراد کی بیرون ملک منتقلی۔

معاشی میدان کے چار پیمانے:

۱۔ غیر متوازن معاشی ترقی۔
۲۔ معیشت کی بدحالی۔
۳۔ مقامی گروہوں کا ریاستی بالادستی سے انکار۔
۴۔ عوام کو صحت اور تعلیم جیسی بنیادی سہولتوں کی عدم فراہمی یا تباہی۔

سیاسی و عسکری میدان کے چار پیمانے:

www.bhutto.org

۱۔ انسانی حقوق کی پامالی۔

۲۔ ملک کے اندر سلامتی کے ایسے ادارے جو خود ایک ریاست قرار دے دیں۔

۳۔ اشرافیہ کا عروج۔

۴۔ بیرونی عناصر یا غیر ملکی دخل اندازی۔

فہرست کو حتمی شکل دیتے وقت ہر ملک کو ان بارہ پیمانوں کی کارکردگی کی بنیاد پر نمبر دیے جاتے ہیں۔ جس قدر ناقص کارکردگی اس قدر زیادہ نمبر "پوائنٹ" دیے جاتے ہیں۔ یعنی مجموعی طور پر سب سے زیادہ نمبر لینے والا ملک سب سے زیادہ ناقص و ناکام ریاست قرار پاتا ہے۔ اس تھنک ٹینک کی ٹاپ مینجمنٹ کے مطابق اس فہرست کو مرتب کرنے کا مقصد ایک تو عوام کی معلومات میں اضافہ کرنا ہوتا ہے انہیں اپنے ملک کی حقیقی صورت حال سے آگاہ کرنا ہوتا ہے۔ سول سوسائٹی کو بیدار کرنا اور حکومتوں کے لیے مشورہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے اندر ایسے عوامل کا سدِ باب کر سکیں جو انہیں ناکام ریاست بنانے کا باعث بن رہے ہیں۔

"دی فنڈ فار پیس" اور "فارن پالیسی" جیسے نامور جریدے اور ادارہ نے پاکستان کو دنیا کی پہلی دس ناکام ریاستوں میں سے ایک قرار دیا ہے جو موجودہ حکومت کے لیے باعث ندامت اور باعث بیداری ہے۔ وہ حکومت جو ہمہ وقت اپنی کامیابیوں کے بے سرے راگ الاپتی رہتی ہے اور ہمارے ملک کے موجودہ وزیر اعظم شوکت عزیز صاحب جو اعداد و شمار کے گورکھ دھندے میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے ان کے لیے اس رپورٹ کے اعداد و شمار کیسے رہے؟؟؟؟؟

ایسا کیوں ہوا؟ ہماری رسوائی اور جگ ہنسائی کا بنیادی سبب کیا ہے؟ میرے نزدیک صرف یہ کہ آئین کی ۔۔۔۔۔ بے حرمتی قانون کی پامالی نصف صدی میں 31 سال 4 فوجی جرنیلوں کے حصے میں آئے۔ بقیہ 19 برس 20 وزرائے اعظم کو ملے ان میں چار وہ وزیر اعظم بھی شامل ہیں جن پر مختاری کی تہمت ناحق ہے۔ وہ چار دراصل مجبور و لاچار وزیر اعظم تھے جو فوجی صدور کے زیر سایہ رہے۔ یہ اس ریاست کا حال ہے کہ جس نے جمہوریت کے بطن سے جنم لیا تھا۔ آئین کے ہوتے ہوئے جب غیر آئینی اقدامات طاقت

www.bhutto.org

کے بل پر اپنا سکہ جما لیں جب حق وصداقت کی نگہبانی کرنے والے ''نظریہ ضرورت'' کی بکل مار لیں جب دستر خوان لذتیں مغلوب ومقصود ہو جائیں ۔ جب اصول ، نظریات ، اخلاقیات ، برداشت اور جمہوری قرینوں کو کوڑیوں کے مول بیچ دینے والے احترام ، انعام اور اکرام کے سزاوار ٹھہریں تو ریاستیں اسی طرح بے آبرو ہو جایا کرتیں ہیں۔

یقین کامل ہے کہ انشاء اللہ پاکستان قائم رہے گا یہ سرزمین خداداد ایک نہ ایک دن نامہربان موسموں ، بے توقیر رتوں کے چنگل سے ضرور نکل آئے گی ۔ آئین وقانون اور سپاہ گری کا فن وزیرستان اور بلوچستان تک محدود نہیں رہے گا ۔ سیاسی حکمت گری کا ہنر صرف محترمہ بینظیر بھٹو پر الزامات اور وطن عزیز سے دور رکھنے کے نقطہ پر مرکوز نہیں رہے گا ۔ آئین ، قانون ، انصاف اور جمہوریت کو منصب ضرور ملے گا جو مہذب ریاستوں کا شیوہ ہوتا ہے ۔ بے بس و لاچار عوام کو ان کے غصب شدہ حقوق ضرور ملیں گے ۔ طویل ترین رات صبح صادق کا راستہ نہیں روک سکتی ، صبح ضرور آئے گی ۔

آج جب نیپال ، سری لنکا ، بنگلہ دیش اور افغانستان بھی ہم سے آگے نکل گئے ہیں ۔ بے توقیری اور زوال کا یہ درجہ ایک دن ضرور ختم ہو جائے گا کہ جب ہمارے ہاں یہ روش اپنی موت آپ مر جائے گی کہ مدعی ملزم ٹھہریں ۔ وہ دن قریب ہے کہ جب سرزمین پاک سے مدعی کو ملزم اور ملزم کو مدعی بنانے کی رسم بد کا مکمل خاتمہ ہو جائے گا ۔

(انشاء اللہ)

www.bhutto.org

14

''جنرل پرویز مشرف کے نام ایک پیغام''

جنرل صاحب آپ نے فرمایا تھا کہ ''اہل قلم کو قومی مفاد کی پاسبانی کرنا اور سچ لکھنا ہوگا۔''

تو جنرل صاحب سچ تو یہ ہے کہ کون بدنصیب ہوگا جو پاکستان کو مضبوط، مستحکم ترقی وخوشحالی سے ہمکنار، آبرومند اور سربلند نہیں دیکھنا چاہتا۔ اہل پاکستان گزشتہ 58 برس سے اسی آرزو کی تکمیل کے بے چینی و بے قراری سے منتظر ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ نہ انتظار ختم ہوتا ہے نہ آرزوئیں پوری ہونے کا وقت آتا ہے۔ خوش گمانیوں کی تمام تر خیال آفرینوں کو بروئے کار لانے اور منفی سوچ کے تمام تر دریچے بند کر دینے کے باوجود یہ یقین کر لینا خود فریبی دکھائی دیتا ہے کہ ''آج کا پاکستان ابھرتا ہوا اور آگے بڑھتا ہوا پاکستان ہے۔''

ممکن ہے کہ کچھ فکری مغالطوں کے شکار یا فکری مغالطوں کا شکار کر دینے والے، بلندیوں پر بیٹھ کر دریا کو لکیر سمجھنے والوں کے نزدیک ایسا ہی ہو مگر زمینی حقائق کا آبنوسی الماریوں میں رکھی فائلوں اور اعداد وشمار کے گوشواروں سے تقابل نہیں کیا جا سکتا۔ ابھرتے اور آگے بڑھتے ممالک کی اُٹھان اور اُڑان کا طریق کار ان کے عوام کے شب و روز کے چلن سے ہوا کرتا ہے۔ ''جنرل صاحب'' سچ تو یہ ہے کہ آگے بڑھتی ہوئی اور ابھرتی ہوئی ریاستوں میں بسنے والی خلق خدا بھوک تنگ دستی اور مفلسی کے باوجود اپنے لہو میں حرارت اور جذبہ احساس میں تمازت محسوس کرتی ہے۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ صبر آزما اور کٹھن مراحل نیز گھٹن زدہ ماحول ختم ہونے والا ہے اور آئندہ دنوں میں یہ ایک پروقار ملک کے

www.bhutto.org

باوقار شہری ہوں گے۔ دشوار گزر راستے اور تھکا دینے والا سفر اپنی تمام تر اذیتوں اور ہولناکیوں کے باوجود ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ منزل مراد قریب سے قریب تر دکھائی دیتی ہے۔ امید و یقین کا یہی زادِ راہ انہیں مشکلات برداشت کرنے کا عزم عطا کرتا ہے۔

جنرل صاحب سچ تو یہ ہے کہ دائروں کے بے ثمر سفر کے آشوب میں مبتلا قوم کے پاس کڑی دھوپ سے بچنے کا سامان نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کے دل ویران اور آنکھیں خوابوں سے محروم ہو جاتی ہیں۔ گہری دھند جیسی محرومی و مایوسی ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ بے شمار تسلیوں کے باوجود انہیں شاخ گلشن پر پھول کھلنے اور دریدہ دلوں کے سلنے کا یقین نہیں آتا۔

جنرل صاحب سچ تو یہ بھی ہے کہ آج سے سات برس قبل کی نسبت وطن عزیز زیادہ خطرات میں گھرا ہوا ہے۔ اس کی سلامتی و بقاء کے خلاف سازشیں کرنے والے قوی ہو رہے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ آپ (جنرل صاحب) اسے ایک قنوطی ذہن کا شوشہ سمجھیں مگر چار سو پھیلتی ہوئی آندھیوں کو بھی نظر انداز کرنا دانشمندی نہ ہو گی۔ جنرل صاحب کیا یہ سچ نہیں کہ فتنہ ساماں تھنک ٹینکس اور بین الاقوامی پریس کے اشارے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے معاملہ میں ''ابلیسی تکون'' براہ راست پوچھ گچھ کے مطالبہ کے بہانے عوام سمیت حکومت اور فوج کو کٹہرے میں لانے کی سازش کا پتہ دے رہی ہے؟

جنرل صاحب یہ بھی ایک سچ ہے کہ مشرقی و مغربی سرحدوں کا بڑھتا دباؤ اور بالشت بھر ''کرزئی'' کی دھمکیاں چہ معنی؟

جنرل صاحب یہ بھی غور طلب بات ہے کہ دن بدن رسوائیوں سے دو چار ہوتی ہوئی ہماری خارجہ پالیسی اور ہمارے غیر ملکی دورے کن وجوہات کی بناء پر بے ثمر ہو رہے ہیں؟ معاشی استحکام کے دعوؤں کے باوجود افق افق ناکام ریاست کے چرچے آخر کیوں؟ بلاشبہ چین مہرباں و نامہرباں موسموں کا ہمارا ساتھی ہے۔ پاک چین دوستی یا تعلقات ہماری قومی تاریخ کا عظیم ورثہ ہیں۔ مگر نائن الیون کی سیاہ رات کو جب امریکہ نے ہمارے سامنے سات (7) ناروا مطالبات رکھے تو ہم نے چین سے مشورہ تک گوارہ نہ کیا کہ ہمارے لیے کون سی راہ مناسب رہے گی؟

امریکہ کو افغانستان میں لا بٹھانے اور اپنے اڈے مہیا کرتے وقت بھی ہم نے

www.bhutto.org

چین سے مشورہ نہ کیا۔ زلزلہ کے بعد نیٹو اور امریکی فوج کو چین کے پاس بٹھاتے وقت بھی ہم نے چین کی حساسیت کا خیال نہ رکھا۔ اپنا سب کچھ امریکی اہداف کی بھٹی میں جھونک دیا ۔ جب ہم نے دیکھا کہ باجوڑ کے واقعہ پر امریکی صدر نے چند جملے تو کجا کوئی حرف تسلی بھی نہ دیا جس دن اور وقت بش افغانستان میں موجود تھا اس دن وزیرستان میں تینتالیس افراد خاک وخون میں نہا گئے۔ پھر کوئی شک باقی نہ رہا کہ امریکہ بنیادی اخلاقی انسانی اقدار سے بے بہرہ ہے۔

شاید خونی جبڑوں کو یاد نہیں رہتا کہ وہ کن جنگلوں کے کتنے پرندے اور چرندے لقمہ بنا چکے ہیں۔ جب سورج سوا نیزے پر پہنچا تو ہمیں یاد آیا کہ چین ہمارا دوست ہے اور اسی کا سائبان عاطفیت اب لازم ہے آخر ہمیں یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا؟ جنرل صاحب کیا یہ حقیقت نہیں کہ آپ نے الیکشن 2002ء میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے والی جماعت میں سے پیٹریاٹ کی بنیاد رکھ دی اور صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے حکومت قائم کی؟ یہ الگ بات کہ صرف ایک ووٹ کے لیے تقریباً 2 دھائی معتبر و مطلوب نیب حضرات کو فلور کراسنگ کروائی۔

آپ کے بقول ''محترمہ بینظیر بھٹو کو عوام نے مسترد کر دیا ہے کیونکہ وہ لوٹ مار میں ملوث ہیں اور یہ کہ انہوں نے قومی خزانہ بیرون ملک منتقل کیا ہے۔'' سچ تو یہ ہے کہ گزشتہ تقریباً آٹھ، نو برس سے انہوں نے انتخابات میں حصہ نہیں لیا تو اس بات کو کس طرح یقین سے کہا جا سکتا ہے یا پھر یہ استدلال کس قدر مضبوط ہے کہ عوام نے ان کو مسترد کر دیا ہے؟ البتہ ہمارے ہاں ذاتی پسند اور ناپسند بذریعہ لفظ عوام کے استعمال سے تصدیق کر دینے کی رسم بہت پرانی ہے۔

قیام پاکستان کے کچھ ہی عرصہ بعد 16 اکتوبر 1951ء کو ملک کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خاں کے سینے میں لگنے والی گولیاں اور موقع پر ہی ان کے قاتل ''سید اکبر'' کو ختم کر دینے کے پیچھے 16 دسمبر 1971ء کا المیہ پنہاں تھا یا انہیں عوام نے مسترد کر دیا تھا؟ ان کے جانشین ''خواجہ ناظم الدین'' جو آئینی وزیراعظم تھے اور پھر کسی بھی آئینی وزیراعظم کے دور میں اسمبلی کے بھرپور اعتماد و تعاون سے بجٹ کا پاس ہونا اس وزیراعظم کو ۔۔۔۔۔ آئینی اعتبار سے مزید پختہ کرتا ہے۔ ایک طرف خواجہ ناظم الدین نے بجٹ پاس کروایا تو

www.bhutto.org

دوسری طرف گورنر "جنرل غلام محمد" نے انہیں برطرف کر دیا اور اسمبلی کالعدم قرار پائی اس دور کے جنرل صاحب (غلام محمد) نے یہی تاثر دینے کی ناکام کوشش کی تھی کہ عوام نے خواجہ ناظم الدین کو مسترد کر دیا ہے۔

سات، اور آٹھ اکتوبر 1958ء کی درمیانی شب جب جنرل محمد ایوب خان نے وزیر اعظم "ملک فیروز خان نون" کی حکومت کا تختہ الٹ دیا وہی ملک فیروز خان نون کہ جس نے اپنی سیاسی وشعوری حکمت عملی سے مسقط کے حکمرانوں سے گوادر کے لیے پاکستان کا حق منوایا تھا۔ اس حق کے لیے بھارتی پنڈت جواہر لال نہرو بھی جدوجہد کرتے رہے۔ آج گوادر کی اہمیت سے کون ناواقف ہے؟ جنرل ایوب خان نے مارشل لاؤں کی رسم ڈالی یا پھر عوام نے "ملک فیروز خان نون" کو مسترد کر دیا تھا؟

مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کو جنرل ایوب خان کی دھن دھونس نے شکست دی یا پھر عوام نے اپنی مادر کو مسترد کر دیا؟ جنرل ایوب خان کی عظیم سیاست کا ہی کارنامہ تھا کہ ملک کے نامور سیاستدان بالخصوص "ملک فیروز خان نون"، حسین شہید سہروردیؒ، خان عبد القیوم خان، مولوی اے کے فضل حق اور محمد ایوب کھوڑو سیاست میں حصہ نہ لینے کے سزاوار ہوئے۔

کیا۔۔۔۔ان سب کو ایوب خان نے ذاتی پسند اور ناپسند اور اپنے خوف سے مسترد کیا یا پھر عوام نے؟

سرینڈر کے بعد جب جنرل یحییٰ خان نے اپنے گورنر پنجاب جنرل عتیق الرحمٰن سے عوامی جذبات کے متعلق دریافت کیا تو انہیں جواب ملا کہ "عوام آپ کا سر مانگتے ہیں" جنرل یحییٰ خان یا عوام کے نزدیک شیخ مجیب الرحمٰن مسترد تھے؟

ذوالفقار علی بھٹو کی مقبولیت اور سیاسی بصیرت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر انہیں کے نامزد کردہ چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق نے امریکی وصہیونی ایجنڈے کے تحت اپنے محسن "بھٹو" کے خلاف تحریک استوار کی۔ بھٹو شہید کو وزارت عظمیٰ سے ہٹایا اور تختہ دار پر چڑھایا کیا ذوالفقار علی بھٹو کو بھی عوام نے مسترد کیا تھا؟

جنرل ضیاء الحق نے بھی بھرپور کوشش کی کہ ذوالفقار علی بھٹو کو عوام نے مسترد کر دیا۔ لیکن حقائق کیا تھے؟ کیا محمد خان جونیجو کو بھی عوام نے مسترد کیا؟ محترمہ بینظیر بھٹو اور

www.bhutto.org

نواز شریف دو، دو مرتبہ وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئے کیا دونوں کو عوام نے مسترد کیا؟ محترمہ بینظیر بھٹو نے ملکی خزانہ بیرون ملک منتقل کیا۔ لہٰذا عوام نے ان کو مسترد کیا۔ لیکن جنرل صاحب سچ تو یہ ہے کہ جو اسمبلی اپنی مدت پوری کرنے کے قریب ہے اگر ان کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو کتنے صاف دامن لوگ موجود ہیں جو نیب (ادارہ احتساب) کو مطلوب ہیں؟

مہنگائی، بے روزگاری، امن امان کی صورت حال، نظام عدل کے احوال، احتساب کی بے چہرگی، ہمہ پہلو کرپشن، بڑھتے ہوئے جرائم، آلودہ پانی سے مرتے ہوئے لوگ، لوڈ شیڈنگ سے بلبلاتی ہوئی بستیاں، کوڑیوں کے بھاؤ لٹتے ہوئے ''قومی اثاثے'' سکڑتا ہوا زرعی سیکٹر، بڑھتا ہوا تجارتی خسارہ، بڑھتی ہوئی افراط زر، بڑھتی ہوئی خودسوزیاں، جامد بیرونی سرمایہ کاری، متحرک بلوچستان و قبائلی علاقہ جات کا سیاسی منظر نامہ، سیاسی عدم استحکام، رسوائیوں سے دو چار داخلہ و خارجہ پالیسی اور کھوکھلی جمہوریت مختصراً نا کام ریاست؟

''جنرل صاحب''! آپ تن تنہا اندرونی و بیرونی خطرات کا سامنا کریں کیا یہ درست ہوگا؟ اور کیا یہ بھی قومی مفاد میں ہوگا کہ وہ ''سیاسی بندوبست'' کہ جن کی سیاست آپ کی وردی کی محتاج و ممنون ہے مقابلہ کر سکے گا؟ یا پھر کوئی اور رہنما اکیلا یہ سکت رکھتا ہے کہ اس آشوب کا رخ موڑ دے۔ میرے نزدیک وہ وقت آ پہنچا ہے کہ ذاتی رنجشوں، کدورتوں اور پسند و ناپسند کو ایک طرف رکھنا ہوگا۔ کیوں کہ آج بھی عوامی امنگوں کی ترجمانی کرنے والا ''جمہوری قلعہ'' ہی بدخواہوں کی سازشوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

جان لیجئے کہ آج وطن عزیز کو برداشت، تحمل، غیر متشدد رویوں، درگذر، ایثار، رواداری اور افہام و تفہیم کی ضرورت ہے۔ انہیں الفاظ میں ''حقیقی خوشحال پاکستان'' کا راز پنہاں ہے۔

www.bhutto.org